جلد ۱۰۴ | دسمبر ۱۹۸۵ء | عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

مولانا مودودی کے سیاسی افکار

مرتبہ: عبدالکریم عابد

ریاست و سیاست کے ۲۴ اہم موضوعات اور عنوانات کے تحت مولانا کی سینکڑوں صفحات پر مشتمل بصیرت افروز تحریروں سے اخذ کردہ مواد اور اقتباسات۔

چند عنوانات پر ایک نظر

- سیاست اور اخلاقیات کا باہمی تعلق۔ — اسلامی قومیت کا نظریہ۔
- تصورِ انقلاب اور طریقِ انقلاب۔ — یورپین نیشنلزم کا جائزہ۔
- اسلامی ریاست کی روح اور ڈھانچا — خارجہ پالیسی کے بنیادی و اخلاقی اصول۔
- اسلامی قانون کی تدوین اور نفاذ۔ — سیاسیاتِ عالمِ اسلام کا تجزیہ۔
- جمہوریت سے متعلقہ مباحث۔

اور

- مولانا مودودی کی سیاسی بصیرت کے بارے میں پانچ اہم مضامین

سائز: ۱۸×۲۳/۸ — قیمت: ۲۴/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ رحمان مارکیٹ - غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر: ۳۲۲۴۶۸ / ۶۸۶۴۳۶

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	دسمبر ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ	جلد ۱۰۴

اشارات:	نعیم صدیقی	۲
حکمت مودودیؒ:		
دعوتِ محمدیؐ کا ایک خاص سبق	جناب محمد یوسف صاحب	۹
مقالات:		
الدعا	جناب عبدالرشید ارشد صاحب	۱۱
نماز میں خشوع	جناب محمد اسحٰق صاحب	۱۹
توکّل	جناب خواجہ غفور احمد صاحب	۳۰
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری	جناب شفقت حسین خادم صاحب	۳۹
رسائل و مسائل:		
امام مہدی	جناب مولانا عبدالمالک صاحب	۵۱
مطبوعات:	(ادارہ)	۵۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سیّد حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

رچرڈ نکسن کو جو اہمیت امریکی حکومت کے در و بست میں بہ حیثیت صدر، اور بہ حیثیت سیاست دان کئی سال حاصل رہی ہے اور آج بھی خارجہ پالیسی کے اہم امور میں اثر اندازی کے جو مواقع اس شخص کو حاصل ہیں، یہ باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے نکسن کے حالیہ فرمودات کا ایک اقتباس ضرور ملاحظہ ہو:

> ہمیں جہاں روسیوں کو اپنے مفادات کے خلاف اقدامات کرنے پر مطعون کرنا چاہیے وہاں یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف روس ہی دنیا بھر کی مشکلات کا ذمہ دار نہیں ہے۔ قوموں کے درمیان آمدنی کا وہ تفاوت جو ان کے خام مال پیدا کرنے اور صرف کرنے کے درمیان ہے، موسمی وجوہ کی بنا پر پیدا ہونے والی خشک سالی، شوریدہ سر مسلم بنیاد پرست اور لیبیا سے ایران تک اُمڈنے والی دہشت گرد مسلم تحریکیں —— یہ تمام مسائل اگر روس نہ بھی ہوتا تب بھی موجود ہوتے۔ لیکن ایسے مسائل سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے، سوویت یونین کو چاہیے کہ وہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکہ اور دوسری مغربی قوموں سے ہاتھ ملا کر چلے۔ روس کو مسلم بنیاد پرستی کے اُبھرنے سے خصوصی طور پر نہ صرف اس لیے تشویش ہونی چاہیے کہ روس کی ایک تہائی آبادی مسلمان ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اسلامی انقلاب تیسری دنیا کے لوگوں کے تعاون کے سلسلے میں روسی انقلاب کا حریف بھی ہے[1]

[1] رچرڈ نکسن۔ حوالہ: نوائے وقت ہفتہ وار انگریزی شیعہ، مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۵ء (ماخوذ از فارن افیئرز)

اُوپر جو اقتباس دیا گیا ہے یہ اُس عناد کا شاہد ہے جو مغربی اور یہودی ذہن کو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ہے۔ رچرڈ نکسن کا اصل مبحث امریکہ اور سوویت رُوس کا لاینحل تنازعہ ہے جس کے چند اسباب ہیں۔ دونوں تباہی کے اسلحہ، خصوصاً جوہری بموں اور دوارہیڈ میزائیلوں کے دوران میں ایک دوسرے کو ہدف بنا کر مسابقت کر رہے ہیں۔ اور اب تو بات سٹار وار تک آ پہنچی ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اپنے آس پاس جہاں کہیں امریکہ کمیونسٹوں کا خطرہ بڑھتا ہوا پاتا ہے وہاں جمہوری اُصولوں کو پامال کر کے فوجی کارروائی کے ذریعے حالات کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔ اور مخالفین کو نشانۂ استبداد بناتا ہے۔ اسی طرح روس اپنے مفاد کے لیے جن علاقوں اور قوموں کو زیرنگین کرنا ضروری سمجھتا ہے ان کے خلاف کُھلے بندوں فوجی جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے اور مزاحمت کرنے والوں کو درندوں کی طرح تباہ کرتا ہے۔

دونوں کے درمیان اسلحہ، علاقے اور منڈیاں کشیدگی کا سبب ہیں۔ پوری دُنیا میں کچھ رُوس کے اڈے ہیں اور کچھ امریکہ کے اڈے۔ کچھ قوموں کا قبلہ اُدھر ہے، کچھ کا اِدھر۔ کُھلے ہوئے بے بس انسانوں کے ہجوم، کچھ اُس کے ریوڑ کی بھیڑ بکریاں اور کچھ اِس کے ریوڑ کی۔ کچھ اربابِ اقتدار اور اصحابِ قلم قصرِ سُرخ کی کٹھ پتلیاں ہیں اور کچھ وائٹ ہاؤس کی۔

یہی وجہ ہیں ان دونوں کے باہم دگر حریف اور رقیب ہونے کے اور انہیں معاملات میں مسابقت نے ان کی عشق گستاخانہ بات کو منقطع میں سرشتے سے ڈال رکھا ہے۔

بالکل بدیہی بات ہے کہ دو ملحد اور مادہ پرست طاقتوں کو متحد ہو کر مشترک مفاد کے لیے کام کرنا چاہیے لیکن الحاد اور مادہ پرستی ہر قوم میں خود پرستی اور مفاد پرستی کو اتنا بڑھا دیتی ہے کہ ملحدوں اور مادہ پرستوں کے درمیان ہمیشہ رسہ کشی ہوتی رہتی ہے۔

یہ بھی ایک خدائی انتظام ہے کہ وہ کسی قوت کے اُبھرنے پر اس کے مقابلے کی دوسری قوت کو اُٹھا کھڑا کرتا ہے اور ایک کے ذریعے دوسرے کو جب چاہے ختم کرا دیتا ہے اور جب تک چاہتا ہے ان میں حریفانہ کشاکش کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ یہ خدائی اُصول اگر نہ ہوتا تو دو ملحد اور مادہ پرست

طاقتوں کی چکی کے پاٹ میں ہر اچھا عقیدہ، ہر مقدس اصول اور ہر پسندیدہ قدر پس گئی ہوتی۔

ایک عرصہ سے دونوں سپر پاورز کے درمیان یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ کس طرح نزاعات کا دباؤ کم کیا جائے، مصالحت کی راہیں نکالی جائیں اور دونوں افہام و تفہیم سے طے شدہ اصول و حدود میں اپنے اپنے مفاد کے لیے کام کریں۔ یہ کوششیں اب تک تقریباً ناکام رہی ہیں۔ لیکن بہر حال سمجھ لینا چاہیے کہ اگر دونوں کو آپس کی ہلاکت آفریں جنگ سے بچنا اور اپنی اپنی قوموں کو بچانا ہے (باقی دنیا کی حیثیت ضمنی ہے) تو انہیں دوسری "یالٹا" کانفرنس تک پہنچنا ہوگا۔ یعنی دو شیرانِ بیشۂ انسانیت ایک نہ ایک دن اس نتیجے تک پہنچیں گے کہ انسانی شکارگاہ کا فلاں حصہ ایک کے لیے اور فلاں دوسرے کے لیے۔ وہ اس حصے میں جسے چاہے شکار کرے اور یہ اپنے دائرے میں جس کا چاہے خون پئے۔ دو برابر کے صیادوں کا مسئلہ اس کے علاوہ کسی اور صورت میں حل ہو ہی نہیں سکتا۔

صدر نکسن نے اپنے محولہ بالا مضمون میں مستقبل کی یالٹا کانفرنس تک پہنچانے والے طرزِ فکر کی سڑک دکھا دی ہے۔

صدر نکسن نے روس اور امریکہ کے لیے اصل بنائے اتحاد متعین کر دی ہے۔ یعنی دونوں طاقتوں کی نگاہ ان خطرناک احوال پر مرتکز ہوتی چاہیے جو دونوں کے لیے یکساں باعثِ پریشانی ہیں۔

ایسے خطروں کی دو اقسام ہیں: ایک عمومی، ایک اختصاصی!

عمومی قسم میں ذیل کے مسائل شامل ہیں:

۱۔ قوموں کے درمیان آمدنی کا وہ تفاوت جو ان کے خام مال پیدا کرنے اور صرف کرنے کے درمیان ہے۔

۲۔ موسمی وجوہ کی بنا پر پیدا ہونے والی خشک سالی۔

اختصاصی قسم کے تحت جو کچھ آتا ہے وہ یہ ہے:

۱۔ شوریدہ سر مسلم بنیاد پرست۔

۲۔ لیبیا سے ایران تک اٹھنے والی دہشت گرد مسلم تحریکیں۔
نکسن انہی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے سوویت رُوس کو یہ خیر خواہانہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ ان کا مقابلہ کرنے پر توجہ دے اور اس مقابلے کے لیے امریکہ اور دوسری مغربی قوموں سے ہاتھ ملائے۔

اصل اور اہم ترین چیز پر زور دینے کے لیے نکسن ایک بار پھر یہ کہتا ہے کہ:
"اسلامی انقلاب تیسری دُنیا کے لوگوں کے تعاون کے سلسلے میں روسی انقلاب کا حریف بھی ہے"۔
ساتھ ہی توجہ دلاتا ہے کہ رُوس کو خیال رکھنا چاہیے کہ اُس کی ایک تہائی آبادی مسلمان ہے۔

بڑی قابلِ غور بات یہ ہے کہ مغرب کے سیاست کار اور دانش ور پادریوں سے بڑھ کر اسلام کے مخالف اور احیائے اسلام کی تحریکوں کے معاند ہیں۔
سوال یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنے حدود میں کسی مسلک پر چلتی ہے یا اس کے عوام کسی خاص تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں تو جب تک دوسروں کو کوئی ضرر نہ پہنچے انہیں مخالفت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ وہ اپنے گھر میں جس مسلک پر چاہیں کاربند ہوں۔ یہی حق سب کو ملنا چاہیے۔
دوسری بات ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر یہ کیا کرتب ہے کہ "اسلامی بم" کے نام سے پہلے خود ہی ایک ہَوا تیار کیا اور پھر اُسے پروپیگنڈے کی سکرین پر دکھا دکھا کر دنیا بھر کو پاکستان سے متوحش کیا، عین اسی طرح پہلے بنیاد پرستی (FUNDAMENTALIMS) کا گڑا مردہ عیسائیت کے قبرستانِ ماضی سے نکالا گیا اور پھر اُس کو حرکت پسند اور اقدام پسند مسلمانوں کے تصورِ دینداری پر چسپاں کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ جدید اقوام کو مسلم تحریکات کا ذکر ہوتے ہی عیسائیت کے دَورِ تاریک کی ہڈیوں کی سرانڈ آنے لگی۔
یہ صلیبی جنگوں کے جنونی صلیب پرستوں کی ذہنیت ہے جو آج تحریکاتِ اسلامی کے خلاف مغرب کے مذہبی طبقوں ہی میں نہیں، دانشوروں اور اوّل درجے کے سیاست کاروں میں بھی

نتائج و ذرائع ہے۔

مسلمانانِ عالم کے لیے کتنی بڑی مشکل ہے کہ اگر وہ حالتِ جمود میں پڑے رہیں، مغرب والوں کے قصیدے کہتے رہیں، غیر سیاسی مسلک اختیار کریں، تصوف کی خانقاہیں آباد کریں یا نیکی کی تبلیغ کرتے رہیں، ان سے مغرب خوش، مغرب کا خدا خوش۔ لیکن اگر وہ حیاتِ تازہ حاصل کرنے کے لیے قرآن سے نور اخذ کریں، رسول اللہ کو اپنا قائد تسلیم کریں۔ اور اپنے آپ کو منظم کر کے تحریکی انداز سے اقدام کی کوشش کریں تو اکابر مغرب کی نگاہوں میں وہ " کالے چوروں" سے کم نہیں۔ صد حیف اس رکیک ذہنیت پر!

اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مغرب یہ چاہتا ہے کہ نہ اسلام کی زندگی افروز قوت کام کرے، نہ مسلمان بیدار و متحرک ہوں، بلکہ ہمیشہ قفسِ جمود میں پڑے رہیں۔ اور مغربی آقاؤں سے قرضے اور اسلحہ اور ایڈ لے کر ان کے اشارہ ہائے ابرو پر ناچا کریں۔

ایک ارب آبادی رکھنے والی عظیم قوم کو زندگی اور ترقی اور خوشحالی اور شائستگی کی راہ سے روکنے کی ہر کوشش بڑے پیمانے کے ایک جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

نکسن صاحب نے اپنے مضمون کے ایک ہی پیراگراف میں دو بڑی باتوں کو نمایاں کر دیا ہے:

ایک یہ کہ لیبیا سے ایران تک کی دہشت گرد تحریکوں کو ختم کیا جائے۔ ایران سے تو امریکہ کو ویسے بھی انتقام لینا ہے،¹ اور روس بھی اس کو نوالہ بنانا چاہتا ہے!

دوسرے یہ کہ افغانستان کا مسئلہ بھی صاف کر دیا ہے۔ آخر افغان مجاہدین سے بڑھ کر اور کون مستحق ہوگا جس پر بنیاد پرستی کی اصطلاح چسپاں ہو سکے۔ نکسنی فلسفہ یہ ہے کہ ایسے بنیاد پرستوں اور چھاپہ ماروں کے خلاف تو امریکہ و روس دونوں کو متحدہ محاذ بنانا چاہیے۔

---

¹ اور ستم یہ کہ ایران والوں نے ہر مسلمان قوم سے بھی کھینچا تانی شروع کر کے خود اپنے لیے ناسازگار حالات پیدا کر لیے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ مصر، سوڈان، پاکستان وغیرہ جملہ ممالک تو اس فلسفے کی زد میں آہی گئے ہیں کیونکہ یہاں "دہشت گرد" مسلم تحریکیں پائی جاتی ہیں۔

کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ ہوا تو اس کے ساتھ ایک ایسی اسکیم بھی بن گئی کہ جس کے مطابق مصر کی تحریک اسلامی کو دبایا جانا تھا۔ اسکیم قبل از وقت فاش ہو گئی، مگر اس کے باوجود اس پہ عمل کیا گیا اور اخوان اور اسلامی طلبہ کو کمزور کیا گیا۔

پاکستان پر امریکہ کی نوازش شروع ہوئی تو توجہ دلائی گئی کہ ہم سرمایہ، اسلحہ اور امداد دیتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں اسلامی تحریک اُبھر کر نقشہ ہی نہ بدل دے۔ چنانچہ ایک بھرپور وار اسلامی جمعیت طلبہ پر ہوا۔

حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک کے حکمران اول تو کسی اسلامی تحریک کو اُٹھنے ہی نہیں دیتے، اُٹھے تو اُسے دبانے کے لیے قانون اور لاقانونیت سے لے کر ذرائع ابلاغ تک ہر ذریعے کو استعمال کرتے ہیں، پھر بھی اگر حکومت پہ نفاذ شریعت کے لیے رائے عام کا زور پڑے تو حکمران قوتیں بڑی خوبصورتی سے تاخیر و التوا کے ایسے لمبے راستے نکال لیتی ہیں کہ پچاس پچاس سال تک "اسلام اسلام" کی گونج ایوانوں میں سنائی دیتی ہے، مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات سے بھی کم۔

لیکن خدا بھی اپنے پرستاروں کے لیے جب راستے نکالنا چاہتا ہے تو عجیب عجیب طریقوں سے نکالتا ہے۔ ابھی دیکھیے کہ ایک بحری اور ایک ہوائی جہاز کے اغوا کا جوڑا ڈرامہ سامنے آیا اُس نے مصر کی رائے عام کے سمندر میں ایک ایسا طوفان اُٹھا دیا جس کی پہلے سے کوئی مثال نہ تھی اور یہ طوفان اسلامی جذبات کا تھا۔

روکنے والے راستے روکتے رہیں، لیکن خدا ایام کو اپنی تقدیرات کے مطابق گردش دیتا ہے گا۔ اور اسلام کے علو کے راستے کھلتے ہی رہیں گے۔

اس وقت اہم مقصود متذکرہ اقتباس کو سامنے لانے کا یہ ہے کہ مسلمان امریکہ اور روس دونوں کے متعلق اچھی طرح جان لیں کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں میں سے کوئی ہمارا خیرخواہ نہیں، دونوں کا مفاد تقاضا کرے تو ہمیں پیس کے رکھ دیں۔

اب ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم ان جعلی خداؤں کے طاغوتی اثرات سے بے نیاز ہو کر اسلام کو ایک متحرک قوت کی حیثیت سے سامنے لائیں، راہِ حق میں منظم اقدام کریں اور اپنے اخلاق کے نمونوں سے یہ سکہ جما دیں کہ اسلام رحمت ہی رحمت ہے۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

دعوتِ محمدیؐ کا ایک خاص سبق

جناب محمد یوسف صاحب - منصورہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ایک اہم سبق ہمیں دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق راہبوں کے گوشۂ عزلت کے لیے نہیں ہے، درویشوں کی خانقاہوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ دُنیا کی زندگی کے ہر شعبے میں برتنے کے لیے ہے۔ جس رُوحانی اور اخلاقی بلندی کو دُنیا فقیروں اور درویشوں میں تلاش کرتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے حکومت کی مسند اور عدالت کی کرسی پر اُٹھا لائے۔ آپ نے تجارت کے کاروبار میں خدا ترسی اور دیانت سے کام لینا سکھایا۔ آپ نے پولیس اور فوج کے سپاہیوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کا سبق دیا۔ آپ نے انسان کی اس غلط فہمی کو دُور کیا کہ خدا کا ولی وہ ہوتا ہے جو تارک الدنیا ہوتا ہے۔ اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ آپ نے بتایا کہ ولایت اس کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل ولایت یہ ہے کہ آدمی ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک تھانیدار، ایک تاجر و صنعت کار اور دوسری تمام ممکن حیثیتوں سے ایک پورا دُنیادار بن کر بھی ہر اس موقع پر اپنا خدا ترس اور دیانت دار ہونا ثابت کر دے۔ جہاں اُس کے ایمان کو آزمائش سے سابقہ پیش آئے۔ اس طرح آپ اخلاق و روحانیت کو رہبانیت کے گوشوں سے نکال کر معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت، صلح و جنگ کے میدانوں میں لے آئے اور وہاں پاکیزہ اخلاق کی حکمرانی قائم کی۔

یہ اسی رہنمائی کا فیض تھا کہ اپنی نبوت کے آغاز میں جن لوگوں کو آپ نے ڈاکو پایا تھا، اُن کو

اِس حالت میں چھوڑا کہ وہ امانت دار اور خلقِ خدا کی جان و مال اور آبرو کے محافظ بن چکے تھے۔ جن لوگوں کو حق مارنے والا پایا تھا، انہیں حق ادا کرنے والا، حقوق کی حفاظت کرنے والا اور حقوق دلانے والا بنا کر چھوڑا۔ آپ سے پہلے دُنیا اُن حاکموں سے واقف تھی جو ظلم و جور سے رعیّت کو دبا کر رکھتے تھے اور اُونچے اُونچے محلّوں میں رہ کر اپنی خدائی کا سکہ جماتے تھے۔ آپ نے اسی دُنیا کو ایسے حاکموں سے روشناس کرایا جو بازاروں میں عام انسانوں کی طرح چلتے تھے اور عدل و انصاف سے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آپ سے پہلے دُنیا ان نوجوانوں سے واقف تھی جو کسی ملک میں گھستی تھیں تو ہر طرف قتلِ عام برپا کرتی، بستیوں کو آگ لگاتی اور مفتوح قوم کی عورتوں کو بے آبرو کرتی پھرتی تھیں۔ آپ نے اُسی دُنیا کو ایسی فوجوں سے متعارف کرایا جو کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتیں تو دشمن کی فوج کے سوا کسی پر دست درازی نہ کرتی تھیں، اور فتح کیے ہوئے شہر سے اگر پسپا ہوتیں تو اہلِ شہر سے وصول کیے ہوئے ٹیکس تک انہیں واپس کر دیتی تھیں۔ انسانی تاریخ ملکوں اور شہروں کی فتح کے قصوں سے بھری پڑی ہے، مگر فتح مکّہ کی کوئی نظیر آپ کو تاریخ میں نہ ملے گی۔ جس شہر کے لوگوں نے تیرہ برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم ڈھایا تھا، اُسی شہر میں آپؐ کا فاتحانہ داخلہ اس شان سے ہوا تھا کہ آپؐ کا سر خدا کے آگے جھکا جا رہا تھا۔ آپؐ کی پیشانی اُونٹ کے کجاوے سے لگی جا رہی تھی۔ اور آپ کے طرزِ عمل میں غرور و تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہی لوگ جو تیرہ برس تک آپؐ پر ظلم و ستم کرتے رہے تھے، جنہوں نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا اور جو ہجرت کے بعد بھی آٹھ برس تک آپؐ سے برسرِجنگ رہے تھے، جب مغلوب ہو کر آپؐ کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے آپؐ سے رحم و کرم کی التجا کی اور آپؐ نے انتقام لینے کی بجائے فرمایا کہ:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ ط

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ جاؤ، تم چھوڑ دیے گئے۔"

(سیرت سرورِ عالم۔ حصہ اوّل۔ ص ۵۳۵ تا ۵۳۷)

الدُّعا

جناب عبد الرشید ارشد صاحب - ریاض - سعودی عرب[1]

(۲)

گزشتہ بحث کے بعد اب ہم اپنے عنوان سے متعلقہ دُعا اور ندا و سوال پر بات آگے بڑھاتے ہیں۔ یعنی پکار کر ہم خود (ضرورت مند ہونے کے سبب) مانگتے ہیں، طلب کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینے کی بات ہے کہ آدمی اُسی کو پکارتا ہے جو اُس کی پکار سُن سکتا ہو۔ اور جو مطلوبہ ضرورت پوری کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہو اور جو خود کسی کا محتاج نہ ہو بلکہ ہر کوئی اُسی کا محتاج ہو۔

مستقل دینی روایت اس سلسلے میں چند ضروری گزارشات یہ ہیں:

— کھُلی چھُپی پکار صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہی سُن سکتے ہیں - اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ[2]

— کسی کی مدد و استعانت بھی صرف اور صرف رب العٰلمین ہی کر سکتے ہیں۔ دینی اور دُنیوی اُمور سبھی اُسی کی مرضی و منشا سے ممکن ہیں اور اُسی کے تابع ہیں کہ وہ "رب العٰلمین" ہے۔ مومن صبح سے رات تک ہر نماز کی ہر رکعت میں " اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[3] کہہ کر بار بار اس کا اقرار کرتا ہے۔

— حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی نے صرف اور صرف اللہ ہی سے

---

[1] صاحب مضمون اب حیدرآباد میں مقیم ہیں۔
[2] ابراہیم - ۳۹ [3] فاتحہ ۵ - ۴

حاجت طلب کی، اور اس سے انحراف کرنے والوں کے رویے کی نفی کی۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ اس کی شہادتیں اور مثالیں موجود ہیں نیز انبیاء نے غیراللہ سے رجوع کو شرک فرمایا اور یہ ناقابلِ معافی گناہ ٹھہرایا۔

——— صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی پوری جماعت میں سے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ انہوں نے حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو پکارا ہو۔

——— تابعین اور تبع تابعین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مقدس زندگیوں کا ریکارڈ محفوظ ہے، اس میں بھی غیراللہ کو پکارنے کی مثال تلاش نہیں کی جاسکتی ہے۔

——— یہی حال ائمہ کرام، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ اور دوسرے جلیل القدر بزرگانِ امت رحمہم اللہ تعالیٰ کی زندگیوں کا بھی ہے۔

——— اولیائے کرام میں سے شیخ عبدالقادر جیلانی ہوں، سید علی ہجویری ہوں، نظام الدین اولیاء ہوں، بابا فرید ہوں، شاہ عبداللطیف بھٹائی ہوں یا شیخ احمد سرہندی ہوں (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کسی کی زندگی کے مصدقہ احوال سے یا ان بزرگوں کے ملفوظات میں سے پکارنے کی ایک مثال بھی غیراللہ سے نہ مل سکے گی۔ کیونکہ جو شخص درجۂ ولایت پر فائز ہوا، جو قطب اور غوث قرار پایا ہو۔ وہ اُسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی سے قربِ الٰہی حاصل کر پایا اور جسے قربِ الٰہی نصیب ہوا تھا اُس کے متعلق یہ کہنا یا فرض کرلینا کہ اُس نے غیراللہ کو کبھی پکارا ہوگا یا پکارنے کے لیے کہا ہوگا بہتان ہے۔

اب یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ جن انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، آئمہ عظام اور اولیاء کرام رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے خود اپنی اپنی زندگیوں میں اپنی ہر حاجت کے لیے اور ہر مشکل میں، صرف اور صرف اللہ ہی کو پکارا تھا، جس کا مطالبہ بھی خالق ہی کی طرف سے تھا، انہوں نے اپنے متبعین کو یہ کبھی نہ فرمایا ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کے بجائے ہم سے بھی رجوع کرلیا کرنا، کہ مومن کی شان، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی "وہ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی کچھ اپنے مومن بھائی کے لیے پسند کرتا ہے"۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات اُن سے مصدقہ حالت میں ملتی تو بلاخوف یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اُن کے مقام و مرتبہ کے تعین میں غلطی ہوگئی ہوگی، مگر الحمدللہ کہ نہ اُن کا اپنا عمل ایسا تھا نہ

انہوں نے بعد میں آنے والوں کو ایسا غلط راستہ دکھایا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض کج فکر لوگوں نے اپنے نفس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے، ان اولیائے کرام کو بطور ڈھال استعمال کرنے کی خاطر، اُن سے غلط باتیں منسوب کر دیں۔[۵]

توحید کا تقاضا عقیدۂ توحید یہ کہتا ہے کہ سارا لبست وکشاد اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی معطی اور داتا ہے، وہی کاشف الضر اور حل المشکلات یا مشکل کشا ہے، تنہا وہی حامی و ناصر اور ولی و وکیل یا دستگیر ہے۔ عجز و انکساری کے پُتلے حضرت علی، جن کا شجاع ہونا، فاتح خیبر کا اعزاز پانا، تاریخ کا حصہ ہے، وہ ساری عمر اللہ تعالیٰ ہی کو مولا مشکل کُشا پکارتے رہے۔ اس سلسلے میں ہم فرمانِ باری پیش کرتے ہیں تاکہ کوئی بھی اُلجھن باقی نہ رہے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝[۱]

(یہ تمہارے مددگار نہیں) بلکہ خدا تمہارا مددگار ہے اور سب سے بہتر مددگار ہے۔)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... الخ[۲]

(یہ اس لیے کہ جو مومن ہیں ان کا خدا کارساز ہے ......)

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝[۳]

(.... خدا کے دین کو تھامے رہو، وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست ہے اور خوب مددگار ہے۔)

وَاللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝[۴]

(.... اور خدا ہی تمہارا کارساز ہے اور وہ دانا اور حکمت والا ہے)

---

۵ اگر نبی کے علاوہ کسی اور کے حوالے سے کوئی بات سامنے لائی بھی جائے تو اُس کو کتاب وسنت کے معیارات پر پرکھا جائے گا۔ مطابق ہو تو قبول، ورنہ کتاب وسنت کی بات اٹل رہے گی۔ (ترجمان القرآن)

۱ آلِ عمران - ۱۵۰ ۲ محمدؐ - ۱۱ ۳ الحج - ۷۸
۴ التحریم - ۲ -

وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ [1]

(اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں ہے)

آدابِ دُعا | پکارنے اور مانگنے سے متعلق غلط نظریات کی نشاندہی کے بعد اب ہم پکارنے یا مانگنے کے آداب سامنے رکھیں گے۔ دُنیا میں بھی مانگنے والے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ جس سے مانگنا ہو جھٹ سے مطالبہ اس کے سامنے نہیں رکھتے بلکہ موقع اور تعلق کی مناسبت سے پہلے چند ابتدائیہ جملے کہہ کر حرفِ مدّعا زبان پر لاتے ہیں۔ ربّ العزّت جو ہمارے دلوں کا حال جانتے ہیں، اگرچہ اس بات کے محتاج نہیں ہیں، تاہم یہ انسان کی اپنی ضرورت ہے کہ وہ آداب کو ملحوظ رکھے۔ اِس ضمن میں ہم یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان کا مفہوم آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔ نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے مانگنے لگو تو پورے یقین سے مانگو، پہلے اس کی حمد و ثنا بیان کرو، پھر مجھ پر درود پڑھو اور پھر اپنا مقصد و مدّعا بیان کرو اور دُعا کے آخر میں پھر اللہ کی حمد و ثنا اور مجھ پر درود پڑھو، تمہاری دُعا قبول ہوگی کہ اللہ کے ہاں دُعا سے بڑھ کر کسی چیز کی وقعت نہیں ہے۔

مسجدِ نبوی الشریف میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے نماز ختم کر کے دُعا کے لیے ہاتھ بلند کیے، پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان فرمائی پھر درود پڑھا، یہ حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیکھ رہے تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کیا خوب طریقہ ہے، مانگ، جو کچھ مانگے گا، ملے گا۔ بزرگ کہتے ہیں کہ جس دُعا کے اوّل و آخر حمد و ثنا اور درود ہوگا وہ بارگاہِ ربّی میں یقیناً پیش کی جائے گی کہ فرشتوں کو حمد و ثنا اور درود تو بہر حال لے ہی جانا ہے اس طرح طلب بھی اس کے ساتھ جائے گی۔

آدابِ دُعا ہی کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اَنَّهٗ قَالَ لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ؟ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ يَسْتَجِيْبُ لِیْ، فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ

[1] محمد - ۱۱

ذٰلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَآءَ [1]

(حضرت ابوہریرہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا بندہ کی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے بشرطیکہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ لوگوں نے پوچھا، اے اللہ کے رسول جلد بازی کا مطلب کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ دعا کرنے والا یوں کہے کہ میں نے بہت دعا کی لیکن قبول نہیں ہو رہی ہے اور پھر تھک کر وہ دعا کرنا بند کر دیتا ہے)

آداب دعا کے ساتھ قبولیتِ دعا کا درجہ بھی ذہن نشین کیجیے کہ یہ کسی طرح کم اہم نہیں ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ كَرِيْمٌ، يَسْتَحْيِيْ اِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ اِلَيْهِ يَدَيْهِ اَنْ يَّرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَيْنِ۔ [2]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ حیادار اور سخی ہے۔ جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے پھیلاتا ہے تو ناکام خالی ہاتھ لوٹاتے اسے شرم آتی ہے)۔

نبیٔ برحق اور صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی روشنی میں خالق کائنات جو قادر مطلق اور علیم و خبیر اور حکیم وغیرہ ہے۔ اس کے علاوہ اور کون سی درگاہ، کون سا بزرگ اور کون سی ہستی ہے جو اتنی واضح ضمانتِ قبولیت دیتی ہے۔ عقلِ سلیم کہتی ہے کہ ایسے مہربان دینے والے کی موجودگی میں اس کی مخلوق سے لینے کی کوشش تو رہی ایک طرف، اس کا تصور کرنا بھی، خالق سے تعلق کی توہین ہے۔ ایک مسلمان زبان سے ہزار بار ایسے رویے کی نفی کرے گا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً اولاد کے لیے، روزگار کے لیے، زندگی کی عملی مشکلات سے خلاصی کے لیے، لوگ دربدر مارے مارے پھرتے ہیں اور انہیں اس بات کا شعور نہیں کہ اس دنیا کے تمام انبیاء و اولیاء مل کر نہ کسی کا دانہ رزق کم کر سکتے ہیں، نہ بڑھا سکتے ہیں۔ جس روح کا دنیا میں آنا لکھا ہی نہیں گیا وہ

---

[1] مسلم، بحوالہ سفینۂ نجات۔ کتاب الذکر والدعا والتوبۃ والاستغفار۔

[2] ابوداؤد و ترمذی۔ سلیمان فارسیؓ (بحوالہ سفینۂ نجات)۔

اُن کی فریاد پر نہیں آسکتی اور جس کو آنا ہے اُسے کوئی روک نہیں سکتا تاہم یہ بات کسی طرح بھی دُعا کی نفی نہیں کرتی جو کسی سے کرائی جائے۔

دُعا اور تقدیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان کے متعلق کسی کو شک نہ رہے اگر شاید مذکورہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان سے ٹکراتی ہے) کہ" دُعا اور صدقہ سے تقدیر ٹل جاتی ہے"۔ بلکہ بات یوں سمجھ میں آتی ہے کہ اُن نازک لمحات میں دُعا و صدقہ کی طرف رجوع بھی تقدیر ہی کا حصہ ہے*۔ خالق نے انسان کی تخلیق سے پہلے انسان کی پیدائش سے موت تک اور پھر قبر سے نشر تک ہر تفصیل طے کردی ہے۔ اور چونکہ عملی زندگی کے متعلق انسان کا علم محدود ہے (اور بلاشبہ تخلیق اپنے خالق کے مقابلے میں حقیر ترین ہوتی ہی ہے)۔ لہٰذا اُسے یہی بتایا گیا کہ تم ان تعلیمات کو تھام لوگے تو تمہاری زندگی خالق کی منشا کے مطابق ہوگی، اِسی لیے دُعا کرتے رہنے اور انفاق فی سبیل اللہ کی طرف اس کو توجہ دلائی گئی۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کسی بزرگ کے پاس جاکر یا بذریعہ خط اور فون وغیرہ، اُن سے یہ کہنا کہ آپ میرے لیے دُعا فرمائیے، غیر شرعی فعل نہیں ہے بلکہ اس طرح دُعا کرانا پسندیدہ عمل ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ ایجاد کرنا البتہ محلِ نظر ہے۔

قبولیتِ دُعا کے سلسلے میں یہ حدیث بھی بہت ہی اہمیت کی حامل ہے اور خالق و مخلوق کے تعلق میں استحکام پر روشنی ڈالتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُوْا بِدَعْوَۃٍ لَیْسَ فِیْہِ اِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَۃُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ بِھَا اِحْدٰی ثَلٰثٍ اِمَّا اَنْ یُّعَجِّلَ لَہٗ دَعْوَتَہٗ، وَاِمَّا اَنْ یُّدَّخِرَھَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ وَاِمَّا اَنْ یَّصْرِفَ

---

* حدیث کے الفاظ ہیں " وَالدُّعَاءُ مِنَ الْقَضَاءِ اَیْضًا " (یعنی دُعا بھی اللہ کے ہاں مقدر ہوتی ہے) بحوالہ حِصنِ حَصین تاج کمپنی۔

عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا، قَالُوْا اِذًا نُكْثِرُ قَالَ اللّٰهُ اَكْثَرُ۔ [1]

(ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب کوئی مسلمان دعا کرتا ہے جس میں کسی گناہ اور قطع رحمی کی بات نہ ہو تو اللہ ایسی دعا کو ضرور قبول فرماتا ہے یا تو اس دنیا ہی میں اس کی دعا قبول فرمالیتا ہے اور اس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے یا آخرت میں اس کے لیے ذخیرہ بناتا ہے یا اس پر کوئی آفت و مصیبت آنے والی ہو تو ٹال دیتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا پھر تو ہم بہت زیادہ دعائیں مانگیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ بھی بہت دینے والا ہے)۔

مزید آداب و شرائط دعا مانگنے کے آداب ہی کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں کہ قبولیت اتنی ہی یقینی ہے جتنا ان سب پر عمل ہے:

۱۔ کھانے، پینے، پہننے اور کمانے میں حلال ذرائع کا خیال رکھنا اور حرام بلکہ مشکوک سے بھی بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنا پہلی شرط ہے۔

۲۔ رب العزت کے لیے اخلاص، شوق و رغبت اور یکسوئی (دعا سے پہلے اور بعد حمد و ثنا اور درود شریف پڑھنا نہ بھولنا)۔

۳۔ جسم، لباس اور خیالات کی پاکیزگی کا خیال رکھنا اور جبر و بے حق کی بھی طلب کرنا۔

۴۔ دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر تک اٹھانا کہ پھیلے ہاتھوں سے مانگنا معلوم ہو۔[2]

۵۔ رب العزت کی عزت و جلال اور عفو و کرم یا اپنے اچھے اعمال کے وسیلے سے دعا کرنا۔

۶۔ ایک سے زیادہ افراد دعا میں شریک ہوں تو اجتماعی دعائیہ کلمات کہے جائیں، مانگنے والے کا جملہ مکمل ہونے پر باقی سب آمین کہیں۔

۷۔ کسی دعا پر ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ نہ ہو کہ مجھے تو یہ مطلوبہ حاجت دینی ہی ہوگی وغیرہ،

[1] مسند احمد (بحوالہ سفینۂ نجات)

[2] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِیْ اِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ اِلَيْهِ يَدَيْهِ اَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَيْنِ ○ (سلیمان فارسیؓ - ابو داؤد و ترمذی) ترجمہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

بلکہ شروع سے آخر تک عاجزانہ رویہ ہو۔

۸۔ دعا مانگتے وقت ہر لفظ سوچ سمجھ کر زبان سے نکالے کہ اگر یہ قبول ہوگا تو میری زندگی پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ مثلاً ایک دوست کی روایت ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف ختم کر کے کعبہ کے دروازے اور حجر اسود کے درمیان ملتزم (جو دعا کی قبولیت کا مقام ہے) پر دعا کرنے میں مصروف تھے کہ قریب ہی سے ایک شخص کی گریہ وزاری کرتے ہوئے یہ فریاد کان میں پڑی، وہ ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا کہ "یا اللہ میرے کاروبار میں اتنی برکت دے کہ مجھے دو منٹ کا چین نہ ملے"۔ ہمارے مرحوم دوست فرماتے ہیں کہ میں اپنی دعا تو بھول گیا اور اس کی دعا پر غور کرنے لگا کہ یہ انسان اپنے لیے خیر مانگ رہا ہے یا شر، کیونکہ اگر اس کی یہ دعا قبول ہو جائے تو اس کی زندگی کا سکھ چین چھن جائے گا جو دوسری چیز سے زیادہ اہم ہے۔ اسی بات کو قرآن پاک میں اللہ رب العزت نے یوں بیان فرمایا۔

وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ[۱]

(.....عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے مگر وہ تمہارے لیے مضر ہو اور ان باتوں کو) خدا ہی بہتر جانتا ہے، تم نہیں جانتے)۔

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا[۲]

(اور انسان جس طرح جلدی سے بھلائی مانگتا ہے، اسی طرح برائی مانگتا ہے، اور انسان جلد باز پیدا ہوا ہے)۔

(باقی)

---

[۱] البقرہ - ۲۱۶

[۲] بنی اسرائیل - ۱۱

نماز میں خشوع

جناب محمد اسحٰق صاحب - ریاض - سعودی عرب

نماز کی ادائیگی آقا و مالک کے سب سے بڑے حکم کی تعمیل اور اسی کی بارگاہ میں حاضری ہے نیز بے شمار اخلاقی، دینی اور معاشرتی فوائد کا ذریعہ۔ مگر یہ فوائد اسی صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب اسے مسنون طریقے سے اور پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے۔ یاد رکھیے محض نماز ادا کرنے کا حکم کہیں نہیں آیا۔ بلکہ اس کے لیے قیام اور محافظت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ محافظت کا جہاں یہ تقاضا ہے کہ نماز مسنون طریقے سے مقررہ اوقات میں باجماعت ادا کی جائے اور کبھی ناغہ نہ کیا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ پورے [illegible] خضوع سے ادا کی جائے۔ قرآن کریم میں خشوع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

خشوع ہی دراصل نماز کی روح اور اس کا حاصل ہے۔ نماز کے ثمرات ہمیں اس لیے حاصل نہیں ہوتے کہ ہم اسے محض عادۃً یا رواجاً پڑھتے ہیں۔ اور اس سے خشوع کا اہم عنصر غائب یا تقریباً غائب ہوتا ہے۔ جس جسم سے روح غائب ہو اس کا فائدہ معلوم۔ آئندہ سطور میں نہایت اختصار سے یہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ نماز میں خشوع کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

بھوک پیاس، یا دیگر حوائج ضروریہ لاحق ہوں یا کوئی ہنگامی مشکل آڑے آجائے تو نماز سے پہلے اس سے فراغت حاصل کر لی جائے تاکہ نماز کے دوران توجہ اس طرف مبذول نہ ہو اور نماز اطمینان سے ادا کی جا سکے۔

اگر ان فطری تقاضوں کی طرف متوجہ ہونے سے نماز باجماعت سے محروم ہونا پڑے تو اسے گوارا کر لیا جائے۔ بعد میں کسی کو ساتھ ملا کر یا اکیلے ہی نماز ادا کر لی جائے۔ نیند کے غلبے کے وقت بھی

نماز پڑھنا درست نہیں۔ سنت یا نفل کی صورت میں نماز ترک کر کے سو جانے کا حکم ہے۔

جائے نماز پر کھڑے ہوتے ہی جھٹ سے نماز کی نیت نہ باندھ لی جائے بلکہ ذہن کو نماز کے لیے ذرا تیار کیا جائے۔ وہ اس طرح کہ ذہن سے تمام خیالات نکال کر یہ تصور باندھنے کی کوشش کی جائے کہ میں احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہوں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ذہنی تیاری کا عمل وضو کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وضو بجائے خود عبادت بھی ہے اور نماز کے لیے پیشگی شرط بھی۔ وضو کے دوران ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت بھی پیشِ نظر رکھیے۔ کیونکہ احادیث کی رُو سے اعضائے وضو دُھلنے کے ساتھ ساتھ سابقہ گناہ بھی دُھلتے جاتے ہیں[1]۔ یہ ظاہری اور باطنی طہارت کا اہتمام کس لیے ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ آپ صاحبِ عظمت و جبروت کے دربار میں حاضر ہونے والے ہیں۔ بس اس خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسجد کی طرف یا جائے نماز کی طرف قدم بڑھایئے۔

اس ذہنی تیاری میں صرف چند منٹ صرف ہوں گے۔ لیکن اس کے دو فائدے ہوں گے، ایک یہ کہ خیالات کا انتشار ختم ہو کر یک سوئی پیدا ہوگی، دوسرے اخلاصِ نیت حاصل ہوگا۔ اور یہ دونوں باتیں بے حد اہم ہیں۔ جناب علی بن حسینؓ (امام زین العابدین) نماز کی تیاری کرتے تو چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ پوچھنے پر فرمایا: یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں کہ کس کی بارگاہ میں حاضر ہونے چلا ہوں۔

نظر کو بھٹکنے نہ دیا جائے بلکہ سجدے کی جگہ پر مرکوز رکھا جائے۔ آنکھیں بند نہ کی جائیں تاہم بعض اکابر نے لکھا ہے کہ اگر نگاہ کنٹرول کرنے کے لیے ضروری ہو تو ایسا کرنا جائز ہے۔ ایک حدیث میں آسمان کی طرف نگاہ اُٹھانے کی خصوصیت سے ممانعت آئی ہے۔

اگر نمازی کے کپڑوں پر یا جائے نماز پر نقوش وغیرہ بنے ہوئے ہوں یا قریب ہی کوئی ایسی چیز ہو جو نگاہ کو اپنی طرف کھینچنے والی ہو تو نماز شروع کرنے سے پہلے اس کو بدل دینا چاہیے تاکہ نماز کے دوران نگاہ بار بار اس طرف کو نہ اُٹھے۔ کیونکہ اس صورت میں نگاہ کے ساتھ ہی ذہن بھی اس طرف متوجہ ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ کسی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چادر بطور ہدیہ دی جس پر کچھ

---

[1] اسی لیے وضو کے آخر میں یہ کلمات پڑھنا مسنون ہے: اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین۔ (ن۔ص)

نقوش بنے ہوئے تھے۔ آپ نے اس چادر کو اوڑھ لیا اور کچھ دیر بعد اسی میں نماز ادا کی۔ نماز کے دوران آپ کی نگاہ اس کے نقوش پر پڑی۔ آپ نے نماز سے فارغ ہوتے ہی چادر اتار کر کسی کو دے دی اور فرمایا نماز میں میری توجہ اس کے نقوش کی طرف چلی گئی تھی۔

نماز میں بلاضرورت ڈاڑھی یا سر کھجانے، کپڑے کو درست کرنے، آگے پیچھے کو حرکت کرنے، کھانسنے اور جمائیاں لینے، انگلیاں چٹخانے اور اسی طرح کی دوسری حرکات سے اجتناب کیا جائے۔ چھینک اور جماہی کو روکنے کے لیے اُلٹا ہاتھ یا کپڑا وغیرہ منہ پر رکھنا چاہیے۔ مذکورہ حرکات سے اجتناب اس لیے ضروری ہے کہ یہ نماز سے باہر کے اعمال ہیں اور خشوع کے منافی ہیں۔ تکبیر تحریمہ کو تحریمہ کہتے ہی اس لیے ہیں کہ اس سے دُنیوی باتیں اور کام حرام ہو جاتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز کے دوران ڈاڑھی کھجاتے دیکھا تو فرمایا: اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔

یوں بھی عظیم آقا کے سامنے اس طرح کی حرکات خلاف ادب ہیں۔ دُنیوی افسر اور حاکم کے سامنے بھی ایسی حرکات سے اجتناب کیا جاتا ہے تو اللہ جو حقیقی مالک ہے اور شہنشاہ کائنات ہے اس کے سامنے ایسی حرکات کیونکر روا ہو سکتی ہیں۔ جی ہاں اس دربار کی حاضری کے بھی کچھ آداب ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پوری طرح اسی طرف متوجہ رہا جائے اور خلافِ ادب کوئی حرکت نہ کی جائے۔

دائیں بائیں یا گرد و پیش کی کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی جائے، خصوصاً فرض نماز میں۔ حدیث میں آیا ہے کہ یہ شیطان کی دخل اندازی ہے جو وہ نماز خراب کرنے کے لیے کرتا ہے۔ ظاہر ہے شیطان ہمارا دشمن ہے۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے کہ دل میں وسوسے ڈالتا ہے اور اللہ سے غافل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ جب بندہ دنیا کے کام کاج چھوڑ کر طہارت حاصل کرنے اور نماز پڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان مختلف حیلوں بہانوں سے اُسے نماز سے روکنے کی کوشش کرتا ہے اور جب بندہ اس کا کہنا نہیں مانتا اور نماز شروع کر ہی دیتا ہے تو شیطان دوسری چال چلتا ہے۔ اب وہ نمازی کی توجہ خدا کی طرف سے ہٹانے کے لیے وسوسہ اندازی شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں کام کو یاد کر اور فلاں بات کو یاد کرو۔

نمازی کو چاہیے کہ ان خیالات کو جھٹک دے اور یہ تصور باندھے کہ میں ایک ادنیٰ غلام کی حیثیت سے اپنے شہنشاہ کے سامنے کھڑا ہوں جو خود بھی میری طرف متوجہ ہے۔ ایسے میں میرا کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہونا بڑی بے ادبی ہے۔ اسلاف کی مثالیں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہونے تو دُنیا وما فیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نماز ادا کر رہے تھے۔ ان کا ایک بچہ مکان کی چھت سے گر گیا۔ گھر میں شور و غُل مچ گیا اور ہنگامے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مگر انہیں کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ بدستور اطمینان و یکسوئی سے نماز ادا کرتے رہے۔ جب نماز ختم ہوئی تب انہیں حادثے کا علم ہوا۔ پوچھنے پر کہنے لگے مجھے کیونکر پتہ چل سکتا تھا۔ میں تو نماز میں تھا۔

تمام ارکان اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کیے جائیں۔ جلدی نہ کی جائے۔ عہدِ نبوت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے مسجد میں نماز پڑھی۔ آنحضورؐ بھی قریب ہی تشریف فرما تھے۔ نمازی نے جلدی جلدی نماز ادا کی۔ پھر آنحضرتؐ کے قریب آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ آپؐ نے اُسے فرمایا" لوٹ جا اور دوبارہ نماز پڑھ کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی"۔ اُس نے تین یا چار مرتبہ نماز پڑھی کیونکہ آنحضورؐ ہر مرتبہ فرماتے کہ پھر نماز پڑھ، تیری نماز نہیں ہوئی۔ تب اُس نے کہا کہ حضورؐ مجھے سکھائیے کہ کس طرح پڑھوں۔ آپ نے فرمایا: ہر رکن کو اطمینان و سکون سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کر۔ آپؐ نے قومے، جلسے، رکوع اور سجدے کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا اور ہر ایک کو اطمینان و سکون سے ادا کرنے کی قید لگائی۔ یہ واقعہ حدیث کی صحیح ترین کتابوں، بخاری اور مسلم دونوں میں مذکور ہے۔

حضرات ذرا رُک جائیے اور سوچیے۔ کیا آج اکثر و بیشتر نمازی اسی طرح نماز نہیں پڑھتے جیسی مذکورہ شخص نے پڑھی اور جسے آنحضورؐ نے غیر مقبول قرار دیا۔ خصوصاً قومے (رکوع کے بعد کھڑا ہونا) اور جلسے (دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا) سے تو ہم لوگ بالکل غافل ہیں، حالانکہ یہ دونوں اسی طرح فرض ہیں جس طرح رکوع و سجدہ ہیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کا رکوع، سجدہ، قومہ اور جلسہ طوالت میں تقریباً برابر ہوتے تھے۔ مگر ہم لوگ ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ اکثر لوگ رکوع سے سر اُٹھاتے ہی سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ کھڑے ہو کر اطمینان سے رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ پڑھنے کا حکم ہے اور حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا

مُبَارَکًا فِیْہِ [1] پڑھنے کی ترغیب ہے۔ اسی طرح پہلے سجدے سے اٹھنے کے فوراً بعد دوسرے سجدے میں چلے جانا منع ہے۔ اس موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کا حکم ہے اور یہ خوبصورت دعا پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاھْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ

ترجمہ: الٰہی مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، مجھے ہدایت دے، مجھے عافیت سے رکھ اور (بہتر) روزی عطا فرما۔

جس نماز کو جلدی جلدی اور سر سے بوجھ اتارنے کے انداز میں پڑھا جائے اسے آنحضورؐ نے "کوّے کی طرح ٹھونگے مارنا" "بدترین قسم کی چوری" اور منافقوں کی نماز" قرار دیا ہے۔ کوے کی طرح ٹھونگے مارنے سے مراد یہ ہے کہ ارکان کو جلدی جلدی ادا کیا جائے اور ایک کو مکمل کرنے سے پہلے ہی دوسرے کو شروع کر دیا جائے۔ مثلاً ایک سجدہ کرنے کے بعد جلسے میں بیٹھنے کی بجائے فوراً ہی دوسرے سجدے میں گر پڑنا۔ کوا جب دانہ دنکا زمین سے اٹھاتا ہے تو ایک دانہ اٹھا کر سر اونچا نہیں کرتا بلکہ فوراً دوسرا اٹھانے کے لئے چونچ زمین پر مارتا ہے۔

نماز میں چوری یہ ہے کہ رکوع و سجود کو کامل طور پہ ادا نہ کیا جائے۔ اذکار کو بے اطمینانی سے جلدی جلدی پڑھنا یا نامکمل پڑھنا چوری ہی ہے، اور چونکہ یہ چوری مالکِ حقیقی کے دربار میں بلکہ عین اس کے سامنے ہے اس لئے عام چوری سے بدتر ہے۔ اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

منافق کی نماز سے مراد بلا عذر نمازوں کو تاخیر سے پڑھنا اور دوران نماز کسل مندی کا اظہار نیز بعض اذکار کو ترک کر کے نماز کو مختصر کر لینا ہے۔

جس حدیث میں جلدی جلدی اور بے اطمینانی سے نماز پڑھنے والے آدمی کا قصہ مذکور ہے اس کی روشنی میں بعض اکابر علماء نے ہر رکن نماز میں "اطمینان و سکون" کو فرض قرار دیا ہے جس کے ترک سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور اس کا دہرانا لازم آتا ہے۔

ایک حدیث میں یہ وعید بھی آئی ہے کہ جو شخص بلا عذر نماز کو تاخیر کر کے اور وقت ٹال

[1] ترجمہ: اے پروردگار تعریف تیرے ہی لئے ہے۔ ایسی تعریف جو کثرت والی (شرک و ریا سے) پاک اور برکت والی ہو۔

کے پڑھتا ہے بایں طور کہ نہ وضو اچھی طرح کرتا ہے نہ رکوع و سجود اطمینان سے کرتا ہے نہ خشوع کا خیال رکھتا ہے تو ایسی نماز سیاہ ہو کر اٹھتی ہے اور بد دعا کرتی ہے کہ اے اللہ جس طرح اس نمازی نے مجھے برباد کیا ہے تو بھی اسے برباد کر دے۔

اس تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک صرف وہی نماز قابل قبول ہے جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کے مطابق ہو۔ غیر مسنون اور رواجی نماز نہ صرف یہ کہ نامقبول قرار پاتی ہے بلکہ الٹا نمازی کے لئے بربادی کا سبب بنتی ہے۔ خشوع کے ضمن میں ان باتوں کا بیان اس لئے ضروری تھا کہ خشوع صرف اسی نماز میں پیدا ہو سکتا ہے جو ظاہری اعتبار سے بھی نبی اکرمؐ کے نمونے کے مطابق ہو اور جس کی ادائیگی میں آنحضورؐ کی ہدایات کو بتمام و کمال پیش نظر رکھا جائے۔

نماز کے تمام اذکار کو ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھا جائے۔ خصوصاً قرآن کی آیات کو۔ کیونکہ قرآن کو ترتیل سے یعنی ٹھہر ٹھہر اور سنوار کر پڑھنے کا حکم ہے لہذا ایک ایک آیت کو الگ الگ سنوار کر پڑھنا چاہیئے۔ بے توجہی سے، تیزی سے اور مشینی انداز میں (MACHANICALLY) ہرگز نہ پڑھیں۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھتے تھے اور سورۂ فاتحہ پڑھنے کا انداز تو یہ ہوتا کہ ایک آیت کو پڑھنے کے بعد توقف فرماتے یعنی سانس توڑ دیتے پھر دوسری آیت پڑھتے اور توقف فرماتے۔ اسی طرح ایک ایک آیت پڑھ کر سورۂ فاتحہ مکمل کرتے۔ لیکن ہمارے ہاں اکثر و بیشتر آئمہ مساجد اس طریقے سے بے خبری کا یا بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نماز تراویح میں تو حد ہی کر دی جاتی ہے کیونکہ انہیں گھنٹے پون گھنٹے میں بہت سی رکعتیں پڑھ کر نمازیوں کو گپ شپ اور دوسرے مشاغل کے لئے فارغ کرنا ہوتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ نماز کے ساتھ اور قرآن کے ساتھ جو کہ بندے کے اظہار عجز و نیاز اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں یہ سلوک نہایت افسوسناک ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ نماز میں پڑھے جانے والے الفاظ کو نمازی زبان سے ادا کرے۔ ہونٹ ہلائے بغیر دل ہی دل میں پڑھنا درست نہیں۔ نماز انفرادی ہو یا اجتماعی، موقع قیام کا ہو یا تشہد کا یا رکوع کا یا سجدے کا۔ الفاظ کی اس طرح ادائیگی ضروری ہے کہ پڑھنے والے کے اپنے کان انہیں سنیں۔

ہمیشہ ایک ہی سورت کی مثلاً سورۂ اخلاص کی تکرار نہ کی جائے۔ سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورتوں کو بدل بدل کر پڑھا جائے۔ اس سے قرأت میں میکانیت کا انداز ختم ہوگا اور شعوری طور پر پڑھنے کا رجحان پیدا ہوگا۔

انفرادی نمازوں میں لمبے لمبے رکوع اور سجدے کیے جائیں اور ان کے اندر اور ان کے ساتھ مسنون دعائیں اور اذکار یاد کر کے پڑھے جائیں۔ احادیث کی کتابوں میں بڑی خوبصورت اور مؤثر دعائیں منقول ہیں۔ ان کو یاد کیجیے اور نمازوں کے ساتھ پڑھیے۔ اس طرح نمازوں میں دل لگے گا نیز حُسن پیدا ہوگا۔ نماز کو جلدی جلدی ختم کرنے کی عادت اور رجحان بھی آہستہ آہستہ ختم ہوگا۔

نماز کے دوران زبان سے نکلنے والے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے اور سوچیے کہ اب میں مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہہ رہا ہوں، اب اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہہ رہا ہوں وغیرہ۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ذہن بھٹکے گا نہیں اور بار بار کی مشق سے خیال بندھ جائے گا۔

اگر قرآنی آیات اور دوسرے اذکار کے معانی معلوم ہوں اور نماز کے دوران ان پر بھی توجہ رکھی جائے تو سونے پہ سہاگہ۔ اس سے توجہ مرکوز کرنے میں مزید مدد ملے گی اور نماز میں دل لگے گا۔ خیالات اور وساوس کو حتی الوسع روکا جائے۔ سو فیصد یکسوئی تو شاید ممکن نہ ہو بس اتنا کافی ہے کہ ہر مرتبہ خیالات کو جھٹک دیا جائے اور ذہن کو اُدھر سے ہٹا کر نماز کے الفاظ و معانی کی طرف موڑ دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی مراقبہ اور مجاہدہ نہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب نمازی کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اللہ فرماتا ہے "میرے بندے نے میری حمد کی"۔ جب وہ کہتا ہے: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو اللہ فرماتا ہے "میرے بندے نے میرے اوصاف بیان کیے"۔ جب وہ کہتا ہے مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ تو فرماتا ہے "میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی"۔ جب نمازی کہتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ فرماتا ہے "یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان منقسم ہے اور اسے دیا جائے گا جو کچھ اُس نے مانگا"۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ ...... وَلَا الضَّالِّیْنَ پڑھنے پر اللہ فرماتا ہے "یہ میرے بندے کے لیے ہے اور اسے ملے گا جو کچھ اس نے مانگا۔"

غور فرمایئے اللہ خود اپنے بندے کی طرف متوجہ ہے اور اس سے ہم کلام ہے۔ لازم ہے

کہ بندہ بھی پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو اور ذوق وشوق سے اس کے کلام کو دل کے کانوں سے سنے۔ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا کہ نماز مومن کی معراج ہے۔ اللہ سے براہ راست ہم کلامی جب کہ درمیان میں کوئی مخل نہ ہو ایمان کی معراج (CLIMAX) نہیں تو اور کیا ہے۔

یہ تو تھی سورۂ فاتحہ کی بات۔ اس سے آگے جب آپ قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھتے ہیں تو بھی اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ آیاتِ رحمت پر سے گزر ہو تو ذرا رک کر اللہ کی رحمت اور اس کے لطف وکرم کی دعا کیجیے۔ عذابِ آخرت کا ذکر آئے تو اللہ کے عذاب سے اس کی پناہ طلب کیجئے اور استغفار کیجیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین کا یہی طریقہ رہا ہے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سجدے کے وقت رحمتِ باری تعالیٰ بندے کی طرف بطورِ خاص متوجہ ہو جاتی ہے۔ یہ گویا انتہائی قرب کا مقام ہے۔ لہٰذا انفرادی (نفل) نمازوں میں خصوصاً سجدوں میں دل لگا کر خوب دعائیں کیا کریں —— ذوق وشوق اور یقینِ قبولیت کے ساتھ۔ اس موقع کے لیے بہترین دعائیں وہی ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدوں میں مانگی ہیں۔ اور ہاں رات کی تاریکی، تنہائی اور سناٹے میں پڑھی جانے والی نماز حصولِ خشوع کا بہترین موقع ہے۔ اس نماز کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے۔

> "(نماز کے لیے) رات کا اٹھنا نفس کو سخت پامال کرتا ہے اور اس وقت ذکر بھی خوب درست ہوتا ہے۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز یعنی تہجد کو نہایت ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ یہ نماز گناہوں کے دور ہونے کا سبب، قربِ الٰہی کا ذریعہ اور جنت میں داخلے کا پروانہ ہے۔ غرض جو بات اس نماز میں ہے وہ کسی دوسری نماز میں نہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی بیان ہوا، قرآنی آیات اور مسنون دعاؤں کا سوچ سمجھ کر اور عاجزی کے ساتھ پڑھنا بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ نماز کی یک سوئی مسمریزم کی سی یک سوئی نہیں۔ یاد رکھیے، عبادت کا مغز دعا ہے اور دعا کی روح عاجزی وانکساری۔ لہٰذا جس قدر ممکن ہو دعا کے وقت عاجزی، تذلل اور بیچارگی کی کیفیت پیدا کریں۔ یہ تصور باندھیں کہ ایک ادنیٰ غلام اپنے عظیم المرتبت شہنشاہ اور محسن آقا کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ عاجزی اور انکساری کے ساتھ نیازمندی کا

اظہار کر رہا ہے۔ بار بار اپنی خطاؤں کا اقرار کر رہا ہے اور معافی مانگ رہا ہے۔ حدیث میں اس کیفیت کو "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"اپنے رب کی اس طرح عبادت کر گویا تو اسے (اپنے سامنے) دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ نہیں تو (کم از کم یہ کہ) وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔"

احسان کے معنی ہیں: خوبصورت بنانا۔ گویا نماز کو خوب صورت بنانا اور سنوارنا یہ ہے کہ نمازی اپنے عظیم آقا کے سامنے ایک ادنیٰ غلام کی حاضری کا نقشہ پیش کرے جس کے دوران میں جسم، زبان اور دل سے عاجزی، انکساری اور شکستگی کا اظہار ہو رہا ہو۔ اور جس کے سامنے اُس کا آقا ہو اور بس۔ دوسری کسی چیز کی اُسے خبر نہ ہو۔

عاجزی اور نیازمندی کے اس اظہار اور عظیم بارگاہ میں حاضری کے احساس سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُسے گہرا کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہاں تک کہ رقّت طاری ہو جائے۔ بس یہی نماز کی جان ہے۔ اسی سے ذکر میں لذّت پیدا ہوتی ہے اور اسی کیفیت کی بدولت نماز نبی مکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کے بقول آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحتِ جان بن جاتی ہے۔ اسی سے دل میں اطمینان کے آبِ حیات کا چشمہ پھوٹتا ہے —— وہ اطمینان جس کا دنیا میں ہر کوئی متلاشی ہے، مگر اُسے مال و دولت میں اور دنیا کی دوسری چیزوں میں ڈھونڈتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس خزانے کی کنجی خود اُس کے پاس موجود ہے۔ کسی صوفی کا قول ہے کہ خزانے کی گٹھڑی تو ہر شخص کے پاس موجود ہے، مگر وہ محض اس وجہ سے عمر بھر کنگال رہتا ہے کہ اس کی گرہ کھولنا نہیں جانتا۔ آپ کو یہ دولت میسر آجائے تو خدا کا شکر ادا کیجیے —— کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے —— نیز اپنی کوشش کو صحیح رُخ پر جاری رکھیے۔

ہر نماز کو اس طرح دل لگا کر اور سنوار کر پڑھیے جیسے یہ آپ کی زندگی کی آخری نماز ہو۔ جس نماز کے بارے میں پڑھنے والے کو یقین ہو کہ یہ اس کی زندگی کی آخری نماز ہے اس میں انتہا درجے کی عاجزی و انکساری اور بیچارگی اور شکستگی ہوگی نیز انتہائی اخلاص اور قبولیت کی تڑپ ہوگی اور دل و دماغ کی پوری توجہ صرفِ دعا ہو جائے گی۔ بلکہ جسم کا رواں رواں زبانِ دعا بن جائے گا۔ اب آپ خود اندازہ کیجیے کہ جس عبادت میں اور دعا میں یہ عناصر موجود ہو جائیں اس کی قبولیت میں کیا

شک ہو سکتا ہے۔

کچھ باتیں اور بھی ہیں جن کا گو نماز سے براہ راست تعلق نہیں لیکن نمازوں کو مؤثر اور پُرخشوع بنانے میں اور دُعاؤں کی قبولیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں :

۱۔ گناہوں سے بچنا۔

گناہوں سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور اس میں سختی (قساوت) پیدا ہو جاتی ہے اور آدمی مزید گناہوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔ اللہ کے ساتھ اس کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اور قساوت کا علاج یہ ہے کہ سچے دل سے توبہ کی جائے۔ اگر توبہ میں اخلاص ہو تو سیاہی دُور ہو کر دل کا آئینہ صاف اور روشن ہو جاتا ہے نیز قساوت کی جگہ دل میں نرمی، عاجزی اور انکساری آجاتی ہے۔

جب دل کی اصلاح ہو جائے تو ذکر میں لذت اور اذکار و ادعیہ میں قبولیت آجاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے معصوم ہونے کے باوجود بکثرت استغفار کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے تعلیم اور ترغیب ہی مقصود تھی۔

۲۔ حلال روزی کھانا۔

عبادت اور دُعاؤں کی قبولیت میں رزقِ حلال کا بڑا دخل ہے۔ آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا کھانا پینا اور لباس حرام کی کمائی سے ہو اُس کی دُعا قبول نہیں ہوتی اگرچہ اس میں قبولیت کی دوسری شرائط موجود ہوں۔

۳۔ زبان پر کنٹرول۔

زبان پر کنٹرول آدمی کو بہت سی خرابیوں، رسوائیوں اور گناہوں سے بچاتا ہے۔ زبان کے نامناسب استعمال میں جھوٹ، غیبت، بہتان تراشی، گالی گلوچ، چغل خوری، خوشامد، مبالغہ آرائی اور غیر ضروری گفتگو وغیرہ شامل ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع اُصول بتایا فرمایا۔ مومن کو چاہیے کہ بھلی بات منہ سے نکالے ورنہ خاموش رہے۔

زبان کا نامناسب استعمال گناہوں کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ جہنم کی طرف۔ جھوٹ بولنے سے اذکار، عبادات اور دُعاؤں کا اثر جاتا رہتا ہے، لہٰذا اس سے بہت بچنے کی ضرورت ہے۔

۴ ۔ نیک لوگوں کی رفاقت ۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند ، ایک مسلّمہ حقیقت ہے ۔ گلاب کے پودوں کے قریب جو مٹی ہوتی ہے، اس میں بھی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے ۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے میل جول اور دوستی رکھنا جن کی نمازیں اخلاص اور خشوع سے مزین ہوں اور جو گناہوں سے بچنے والے ، حلال روزی کھانے والے اور اپنی زبان کو قابو میں رکھنے والے ہوں یقیناً مفید ثابت ہوتا ہے ۔ ایسے لوگوں کو ڈھونڈیے ان سے تعلقات بڑھایئے اور ان کی خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کیجیے ۔

اگر خلوص نیت سے مندرجہ بالا نکات کو زیر عمل لایا جائے اور مذکورہ چاروں صفات کی روشنی میں اپنا محاسبہ جاری رکھا جائے تو انشاء اللہ ضرور نمازوں کے ثمرات ظاہر ہوں گے اور ایمان کی حلاوت محسوس ہوگی کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ " جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنی راہ پر لے آتے ہیں" ۔ نیز فرمایا کہ " جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اُس کی طرف دوڑ کر بڑھتا ہوں " ۔

یقین رکھیئے کہ جو شخص شہنشاہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے وہ محروم نہیں رہتا ۔ دروازے پر بار بار دستک دی جائے گی تو کسی نہ کسی وقت ضرور کھلے گا ۔ بس شرط یہ ہے کہ آدمی یکسو ہو کر اس دروازے پر آ جائے ۔ یعنی باقی سب دروازوں کو چھوڑ دے ۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اپنی راہ میں اخلاص کے ساتھ پیش قدمی کرنے والوں اور اپنے دروازے پر بار بار دستک دینے والوں میں شامل ہونے کی توفیق و سعادت عطا فرمائے ۔ آمین ۔

توکّل

جناب خواجہ غفور احمد ریٹائرڈ ایڈیشنل سیکرٹری واپڈا

توکّل کا معنیٰ "توکل" خالص عربی زبان کا لفظ ہے، گو یہ فارسی اور اُردو میں بھی مستعمل ہے۔ اس سے مراد کسی پر بھروسہ یا تکیہ کرنا اور اپنا کام کسی کے سپرد کرنا ہے۔ اوّل الذکر معنی کے لحاظ سے انگریزی زبان میں ہم اسے لفظ "BANK" سے واضح کر سکتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں شخص کو اپنے مقدمے کی پیروی اور نگرانی کے لیے "وکیل" کر لیا ہے تو اس سے یہ مُراد ہوتی ہے کہ ہم نے اپنا معاملہ فلاں کے سپرد کر دیا ہے اور ہم اب اِس سلسلہ میں بے فکر ہو گئے ہیں۔ عربی زبان میں — بالخصوص قرآن مجید کی زبان میں — اللہ تعالیٰ کے لیے لفظِ "وکیل" انہی معنوں میں آیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسنیٰ میں سے ایک ہے، یعنی ہمارا کارساز، ہمارا سہارا، ہمارے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا، ہمارے کام سنوارنے والا، وغیرہ۔ ایک لحاظ سے لفظ "تعوّذ" بھی "توکّل" کے معنیٰ دیتا ہے، کیونکہ جب انسان اپنے آپ کو کسی کی پناہ میں دیتا ہے تو یہ بات آپ سے آپ ظاہر ہو جاتی ہے کہ جس ہستی کی پناہ لی گئی ہے، وہ "کارساز" ہے، بھروسے کے قابل ہے، کام سنوارنے والی ہے، نگرانی کرنے والی ہے اور (LET DOWN) کرنے والی نہیں۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کی پناہ لینے کے لیے حضورؐ اور دوسرے انبیاءؑ و رسُلؑ کو تاکید کی گئی ہے۔

توکّل کے مفہوم کی وسعت جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا گیا ہے "توکّل" ایک کثیر المعانی اور جامع (COMPREHENSIVE) قسم کا لفظ ہے اور اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ طاغوتی طاقتوں سے ٹکر لینا، وران کی اطاعت قبول نہ کرنا بھی توکّل (علی اللہ) ہی کے سہارے ممکن ہوتا ہے۔ شیطان

کی چالوں اور اس کے ہتھکنڈوں کا صبر و ثبات سے مقابلہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ وہ مردود ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔" توکّل" ہی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ شیطان کو جب تا قیامِ قیامت مہلت دی گئی اور اس نے اللہ کے بندوں کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے اور ہٹانے کے اپنے عزم کا اعلان کیا تھا اُس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں (اللہ نے اُسے مخاطب کر کے) فرمایا۔

ترجمہ:۔"یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا۔ اور توکّل کے لیے تیرا رب کافی ہے۔" (بنی اسرائیل۔ ۶۵)

یعنی تو میرے بندوں کو زبردستی باطل راہ پر نہیں لے جا سکے گا، بلکہ انہیں بہلانے پھسلانے اور غلط مشورے دینے اور موہوم اُمیدیں دلانے کے ہتھکنڈوں کو استعمال کرے گا۔

توکّل کی حقیقت توکّل کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان یہ یقین رکھے کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ اُسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ وہ بڑا زور والا ہے، زمین و آسمان میں اصل حکومت اُسی کی ہے۔ وہی مُسَبِّبُ الاسباب ہے۔ وہی مُقلّبُ القلوب والابصار ہے۔ وہ آگ کو گلزار بنا سکتا ہے، وہ دشمن کو پست ہمت بنا سکتا ہے۔ وہ چاہے تو دشمن کی تمام تدبیریں اور چالیں اُلٹی ہو جائیں۔ ہر جاندار کی چوٹی اُس کے ہاتھ میں ہے، وہ اگر دستگیری کرے تو جمیع جن و انس اکٹھے ہو کر بھی میرا پرِ کاہ کے برابر کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کاروبارِ دنیا ہی کے سلسلے میں نہیں، بلکہ حق پر قائم رہنے اور عین تبلیغ دین کے سلسلے میں طاغوتی طاقتیں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی مجھے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتیں۔ دُنیا کی ہر شے فانی ہے، مگر خدا حیّ و قیوم ہے۔ بڑے سے بڑے دشمن کی رُوح جب چاہے قبض کر لے، اُسے مفلوج کر دے، اُس کو مجنون بنا دے۔ اُس کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا کر دے، اُس کی غلط قسم کے احکام اور رعب دینے والی زبان کو گُنگ کر دے۔ اسی توکّل علی اللہ کی بدولت ہی انبیاء، رسل اور صحابہ کرامؓ اپنے دَور کی بڑی سے بڑی طاغوتی طاقت سے بھڑ جاتے تھے۔ ابراہیم خلیل اللہ کو نمرود، موسیٰؑ کو فرعون اور محمدِ عربی کو قریش نیز رُوم کی شیطانی طاقتوں سے اور صحابہ کرامؓ کو قیصر و کسریٰ سے ٹکر لینے کے لیے یہی "توکّل کی بے پایاں قوت تیار کرتی تھی۔ درسِ توکّل یہ ہے کہ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لَا مُتَصَرِّفَ فِی الْعَالَمِ اِلَّا اللہُ۔

عملی ثمرات | توکل سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ عزتِ نفس کی حفاظت کی خواہش بڑی مضبوط جڑیں بناتی ہے، غیر اللہ کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ مسلمان میں شجاعت پرورش پاتی ہے۔ وہ اللہ کے عالم الغیب ہونے پر دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتا ہے۔ سخت سے سخت مصیبت سے دوچار ہوتے پر بھی گھبراتا نہیں۔ اُس کی کشتی سمندر کی دیو قامت لہروں کے تھپیڑے کھاتی ہے۔ مگر وہ پریشان نہیں ہوتا۔ اُمید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ یاس و قنوطیت سے وہ کوسوں دُور رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اُس کا خدا اس کی مُشکل کشائی کے لیے کافی ہے۔ اُسے اور اُس کی ہر حرکت کو ہر لحظہ اور ہر آن دیکھ رہا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ پر یوں کامل توکل کیا جائے تو خدا تعالیٰ اپنے بندے کی مدد کو پہنچتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کے معاملے پر غور کریں۔ بچپن میں کنویں میں ڈالے گئے۔ غلام کے طور پر مصر میں بکے، عنفوانِ شباب میں (تقریباً ۱۷ برس کی عمر میں)، ایک سنگین اخلاقی جُرم کے الزام میں دَھر لیے گئے اور کئی برس کے لیے جیل میں ڈالے گئے۔ مگر انہوں نے توکل علی اللہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ رہا ہوتے سُرخرو ہوئے اور سرزمینِ مصر میں انہیں تمکنت ملی۔ حضرت موسیٰؑ جان بچا کر نکلے، کیونکہ اُن سے نادانستہ ایک قبطی قتل ہو گیا تھا۔ اللہ کے بھروسے چل نکلے۔ ٹھکانہ ملا، حضرت شعیب جیسا مشفق "آقا" ملا۔ شادی ہوئی اور نبوت سے سرفراز کیے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہر طرح کے مصائب جھیلے، گھر سے بے گھر ہوئے، مُلک سے نکالے گئے۔ ایک بے آب و گیاہ وادی میں پہنچے، اکیلے بیٹے کو اپنی ضعیف العمری میں اللہ کے اشارے پر ذبح کرنے کو تیار ہوئے۔ یہ سب کس "زور" پر تھا؟ یہی توکل علی اللہ، پختہ ایمان کہ میرا مالک مجھے ضائع نہیں کرے گا۔

توکل اور اسبابِ دنیا | اللہ کی ذات پر توکل کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کا دستِ نگر بن جائے۔ توکل یہ نہیں کہ انسان جنگلوں کی راہ لے اور کہے کہ میرے مقدر میں جو ہوگا، مل جائے گا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: لَا رَهْبَانِيَةَ فِي الْاِسْلَامِ (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے)۔ اِس دُنیا میں رہتے ہوئے حتی الامکان اپنے آپ کو کانٹوں سے بچانا ہوگا۔ محنت کر کے روٹی کمانا پڑے گی۔ ایک سمجھدار کسان کی طرح زمین کو ہموار اور صاف کرنا ہوگا۔ ہل چلانا ہوگا، بیج بونا ہوگا۔ پانی میسر ہو تو دینا ہوگا، کھیت کی نگہداشت کرنی ہوگی۔ پھر اللہ پر "توکل" کرتے ہوئے اچھی فصل کی اُمید رکھنا برحق ہوگا۔ مولانا رومؒ کے مقولے: "برتوکل زانوے اُشتر ببند" پر عمل کرنا ہوگا۔

یہ "توکل" ناداتوں کا توکل ہے کہ اعضاء و جوارح کو حرکت دیئے بغیر رزق کی آرزو کی جائے۔ بے عملی کو اپنا شعار بنالیا جائے۔ یا پھر یہ توکل اُن "پہنچے ہوئے" حضرات کا ہے جو اسلام کی رُوح سے نابلد ہیں۔ اور اپنے ارادت مندوں کو بھی بے عملی کی تعلیم دیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی

عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ

یہ دُنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں کا نظام ہی ایسا وضع کیا گیا ہے کہ ایک کو دوسرے کی احتیاج ہے ورنہ "میں بھی رانی تو بھی رانی۔ کون بھرے گا پانی" والا معاملہ ہو جائے گا۔ تدابیر کرنا اور اسباب سے کام لینا توکل کے خلاف نہیں۔ نوحؑ سے کشتی بنانے کو کہا گیا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ آنجناب اور ان کے ایماندار رفقاء کو بغیر کشتی کے بھی نجات دے سکتا تھا۔ خود ہمارے نبی اکرمؐ نے ہجرت کی۔ شدید ترین مصائب جھیلے، خندق کھودی۔ مسجد کی تعمیر کے لیے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ جہاد کے لیے روپیہ اکٹھا کیا۔ گھوڑے اور اونٹ اور تلواریں اور نیزے سبھی کچھ استعمال کیا۔ خندق کھودی، زخم سہے، دُکھ اُٹھائے۔ "معجزات" کو اللہ پر چھوڑا کہ جب چاہے رُونما کر دے۔

نبی اکرمؐ کو قرآن مجید کی آیات کے ذریعے بار بار زندگی بھر توکل کی تلقین کی گئی تاکہ اللہ پر ایمان پختہ ہو اور کبھی بھی "بے صبری" اور "بے کلی" کی کیفیت طاری نہ ہو۔ آغازِ نبوت ہی میں جو بنیادی تعلیم نبیؐ کو دی گئی۔ اس میں "توکل" اور "صبر" سرفہرست تھے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سورۂ مزمل میں فرمایا:

(ترجمہ) "سب سے کٹ کر اللہ کا ہو کر رہ"۔

"مشرق و مغرب کے پروردگار کے علاوہ کوئی معبودِ حقیقی نہیں۔ سو تم اسی کو اپنا وکیل بنا" یعنی اُسی پر توکل کر۔

کئی اور مقامات پر وقتاً فوقتاً توکل کی تاکید کی گئی ہے، مثلاً:

(ترجمہ) "اور خدا پر بھروسہ "توکل" رکھو، جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں"

(الفرقان - ۵۸)

"اور اُس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں اُس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے،

جب تم اُٹھتے ہو اور سجدہ گزاروں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔"
(الشعرا - ۲۱۹)

ایک اور مقام پر فرمایا:

(ترجمہ) " اور ان سے اہم معاملات (امور) میں مشورہ کرو، پھر جب تم عزم کر لو تو اللہ پر توکّل کرو۔ اللہ توکل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے"۔ (آل عمران - ۱۵۹)

مومنوں کی منجملہ صفات کے بارے میں بار بار فرمایا: " وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ" اور وہ اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں) (العنکبوت ، ۵۹)

مقصد یہ ہے کہ اسباب پر نہیں بلکہ " مسبب الاسباب" پر بھروسہ ہونا چاہیے - اسباب تمام کے تمام فانی - بڑے سے بڑا انسان ، خواہ وہ کتنا بڑا " آمر" ہو فانی - اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ میں صدرِ مملکت کا یا فلاں وزیر کا چہیتا ہوں ، تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو" تو عجب نہیں کہ اس فقرے کے مکمل ہونے پر اُسے معلوم ہو کہ وہ تو چل بسے! اسی لیے اُس حیّ قیّوم پر توکل کرنے کے لیے اتنا زور دیا جا رہا ہے، کیونکہ وہ اپنے زور پر زندہ ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا - لہٰذا، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ کا قرآنی حکم ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے ہٹ دھرم قسم کے انسان کے علاوہ کوئی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا - بحوالۂ آیت قرآنی .

" بے شک اللہ توکّل کرنے والے کو محبوب رکھتا ہے" (آل عمران - ۱۵۹)

توکل کرنے سے خدا کی محبوبیت کا عظیم ترین اعزاز عطا ہوتا ہے -

کتبِ سیَر میں یہ بظاہر معمولی مگر فی الحقیقت ایک بڑا اہم واقعہ مرقوم ہے کہ حضور نبی اکرم ایک مرتبہ اپنے رفقاء کے ہمراہ کسی خمیدہ اور بوسیدہ دیوار کے نیچے سے گزرنے لگے تو جلدی سے گزر گئے - صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ نے ایسا کس لیے کیا ، تو جواب میں جو فرمایا اُس کا مفہوم کچھ یوں تھا - یہ احتیاط ہے اور یہ توکّل علی اللہ کے خلاف نہیں -

توکل کے اخلاقی فوائد | توکل علی اللہ سے جو اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں اُن میں سے کچھ یہ ہیں -

۱- اللہ پر توکّل کرنے سے عزم میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور انسان مصائب و آلام کا مقابلہ ایک چٹان کے مانند کرنے کے قابل ہو جاتا ہے -

۲۔ متوکل شخص میں خوف و ہراس اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔

۳۔ توکل کے باعث انسان اپنی شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھانے کے قابل ہوجاتا ہے۔

۴۔ اس سے استغناء پیدا ہوتا ہے جو انسان کو غیر اللہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

۵۔ شیطانی وساوس کے مقابلے میں توکل ایک مضبوط ڈھال کا کام دیتا ہے۔

توکل اور "رزق" انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے۔ (خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا - القرآن)

سو وہ جس معاملے میں بہت متفکر اور پریشان ہوتا ہے۔ وہ "رزق" کا معاملہ ہے۔ "رزق" بہر حال انسان کی ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے کہ اگر اس کے حصول میں دشواری ہو یا قحط سالی سے سابقہ پیش آجائے تو بقولِ شیخ سعدیؒ:

ع کہ یاراں فراموش کردند عشق!

والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید (الفاتحہ) میں اپنے "رحمٰن و رحیم" ہونے کی صفات کے فوراً بعد اپنے "ربّ العٰلمین" ہونے کا اعلان کیا ہے۔ یعنی وہ خدا "تمام جہانوں" کا پالنہار اور پروردگار ہے۔ وہ بری، بحری، فضائی ہر طرح کی مخلوق کو رزق پہنچاتا ہے۔ چرند، پرند، جنگلی جانور، حشرات الارض، غرض ہر ایک کو رزق پہنچا رہا ہے۔ وہ پتھر میں کیڑے کو پالتا ہے، بطنِ مادر میں ماں کے خون کے ذریعے انسان کی پرورش کرتا ہے۔ بچہ ابھی اس دنیا میں آنے والا ہوتا ہے کہ ماں کی چھاتی میں دودھ پیدا کر دیتا ہے۔ ہوا میں اڑنے والے پرندے خالی پیٹ صبح کو نکلتے ہیں۔ ان کی پشتوں پہ رزق نہیں لدا ہوتا۔ مگر دن بھر دانہ چگتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ جب رزق رسانی کا ایسا حیرت ناک اور مکمل انتظام اس پروردگار نے کر رکھا ہے تو پھر انسان اس "رزق" کے گھٹنے یا نایاب ہونے کی فکر کیوں کرے اور اس ڈر سے اپنے ضمیر اور اخلاق کے خلاف کام کیوں کرے۔

یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سی دعائیں سکھائی ہیں اور انبیاء کرام کی بہت سی دعائیں نقل کی ہیں، مگر ہمیں ماسوا ایک یا دو مقام کے کہیں بھی یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ اللہ سے "رزق" کا سوال کرو۔ "فضل" کا سوال کرنے کی تلقین ضرور موجود ہے۔ سورۃ المائدہ میں عیسیٰؑ کی ایک دعا نقل کی گئی ہے، جو بنی اسرائیل کے چند لوگوں کے کہنے پر انھوں نے کی تھی — اے ہمارے رب

ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما، تاکہ وہ ہمارے لیے خوشی (عید) کا باعث ہو — اور ہمیں "رزق" عطا فرما، اور تو "خیر الرازقین" ہے۔ دوسرے مقام پر حضرت ابراہیمؑ سے تلقین کے رنگ میں یہ الفاظ منقول ہیں۔ " وَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ ۔ (اور اللہ کے ہاں رزق تلاش کرو)۔

مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے رزق کے سلسلے میں ایک حقیقت کو بیان فرمایا ہے اور دو مقامات پر تو ایک جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

ترجمہ: "بے شک اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔"

دوسری جگہ ہے،

"بے شک تیرا رب جس کو چاہے فراخی سے رزق دیتا ہے اور جسے چاہے نپا تلا دے ...... الخ (بنی اسرائیل آیت ۳۰)

جب کسی عورت کو طلاق ہو جائے تو اُسے سب سے زیادہ یہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ "رزق" کا اب کیا بنے گا۔ اِس صورتِ حال کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ترجمہ: "جو اللہ پر بھروسہ (توکل) کرے، اُس کے لیے وہ (اللہ) کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔" (سورہ طلاق آیت ۳)

اس سے پہلی آیت کے جو الفاظ ہیں اُن کا ترجمہ یہ ہے:

"اور جو اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا (یعنی تقویٰ اختیار کرے گا) اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ اور اُسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو ......"

بخدا مجھے زندگی میں بارہا اس کا خوشگوار تجربہ ہوا ہے۔ مجھے جب بھی "مالی ضرورت" درپیش ہوتی میں نے اللہ پر توکل کیا، اُس سے دعا کی اور اُس نے میری ضرورت سے زیادہ مجھے دیا — اور ایسی ایسی جگہوں سے دیا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ چنانچہ یہ میرا معمول ہے کہ میں ہر نماز کے بعد یہ آیت

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ...... قَدْرًا (الطلاق ۲-۳)

بالالتزام سمجھ کر پڑھتا ہوں اور مجھ پر رزق کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

ایک اہم حدیث رزق سے متعلق قرآن مجید کی چند اہم آیات کا ذکر اوپر ہو چکا جن سے واضح ہو گیا کہ "رزق" کے معاملے میں پریشان ہونا بڑی نادانی کی بات ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم آیتِ قرآنی جو اس معاملے کے بارے میں حرفِ آخر اور "مہر" کی حیثیت رکھتی ہے، وہ پارہ ۱۲ کی پہلی آیت ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔ (هود - آیۃ ۶)

ترجمہ: زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے اور وہ کہاں سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔"

جب ہمارے "رزق" کا اللہ نے ذمہ لے رکھا ہے تو ہم کیوں نہ اس پر توکل کریں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ نہیں نہیں رزقِ حلال تلاش کرنے کے لیے محنت کرنا ہوگی کیونکہ یہ شریعت کا تقاضا ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ ترجمہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس کے لیے وہ کوشش کرے (النجم - ۳۹)

یہ سعی حلال رزق حاصل کرنے کے لیے بھی اسی طرح ضروری ہے جیسے "درجات" کی بلندی کے لیے پیہم کوشش کرتے رہنا نیک اعمال کے ذریعے!

سورۂ ہود کی متذکرہ بالا آیت ۶ کو بار بار پڑھیے اور اسے حرزِ جاں بنا لیجیے۔ "رزق" کے معاملے میں بے فکر ہو جائیے۔ پوری دیانت داری سے محنت کیجیے اور رزقِ حلال تلاش کیجیے۔ آپ کا توکل آپ کے کام آئے گا۔ یہاں بھی اور اگلی دنیا میں بھی!

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

من احب ان یکون اقوی الناس فلیتوکل علی اللہ ومن احب ان یکون اغنی الناس فلیکن بما فی ید اللہ عزوجل اوثق منہ بما فی یدیہ، ومن احب ان یکون اکرم الناس فلیتق اللہ عزوجل۔ (ابن ابی حاتم)

ترجمہ: جو شخص چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے زیادہ طاقتور ہو جائے اسے چاہیے کہ

اللہ پر توکل کرے اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے ، اُسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اُس پر زیادہ بھروسہ رکھے بہ نسبت اُس چیز کے جو اُس کے ہاتھ میں ہے اور جو شخص چاہتا ہے کہ سب سے زیادہ عزت والا ہو جائے ، اُسے چاہیے کہ اللہ عزّ وجلّ سے ڈرے ۔"

خاتمۂ کلام جو کچھ اُوپر لکھا گیا ہے اُسے بغور پڑھنے اور سمجھنے سے لازم آتا ہے کہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے پوری لگن ، محنت اور دیانت داری سے رزقِ حلال کمانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں (FACULTIES) سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ پر اپنی جملہ ضروریات کے لیے توکل کریں۔ انشاء اللہ وہ کارسازِ حقیقی اور مالکِ کُل ہماری دستگیری و رہنمائی فرمائے گا۔ اور ہمارے حصے کا رزق ہمیں عطا فرمائے گا۔

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے اپنے ظریفانہ کلام اور منفرد اسلوب میں بڑی بڑی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی ہے ، مگر اُن کا درج ذیل قطعہ جو نہ صرف غیر معمولی طور پر سنجیدہ (SOBER) ہے ، بلکہ قرآنی احکام کی ترجمانی کرتا ہے ، تبرکاً ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے ۔

رزقِ مَا يَحْتَاجُ مِل ہی جائے گا
خواہشوں میں مختصر ہو جایئے
فقر سے شیطان ڈراتا ہے اگر
حَسْبُنَا اللّٰه سے نڈر ہو جایئے

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحؒ اجمیری

جناب شفقت حسین خادم صاحب ایم اے۔ اسلامیات

اسلامی دنیا کے لیے ہندوستان کی دریافت اور یافت نئی دنیا کی یافت سے کم انقلاب انگیز نہ تھی۔ پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی میں مسلم تاجروں کی یہاں آمد ہوئی (واضح رہے کہ عربوں کا سلسلۂ تجارت یہاں تک پہلے بھی تھا)۔ پھر جلد ہی غازیوں کے دستے آنا شروع ہو گئے۔ (ابتدا دورِ فاروقیؓ میں)۔ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفیؒ نے سندھ سے ملتان تک کے علاقے کو قوتِ ایمان و شمشیر سے فتح کیا۔ ساتھ ہی ساتھ برصغیر میں صوفیائے اسلام کی خانقاہیں اور روحانیت کے مراکز قائم ہونا شروع ہو گئے۔

حقیقتہً مجموعی ہندوستان کے وسیع تر علاقوں کی فتح کا سہرا اسکندرِ ثانی سلطان محمودؒ غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے سر پہ سجا — مستحکم اور مستقل — مسلم سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین غوری (م ۶۰۲ھ) کے حصے میں آئی۔ روحانی تسخیر کا معرکہ خواجہ معین الدین چشتیؒ (م ۶۲۷ھ) نے انجام دیا۔[1] کہا جاتا ہے کہ ۹۰ لاکھ[2] افراد نے آپ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا۔

آپ کا نسب نامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آپ کی ذات تک نہ صرف دینداری و پرہیزگاری میں ممتاز ہے، بلکہ اس میں مخلوق کی اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بننے والی شخصیات

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۳۱، ۳۲

[2] تاریخ مشائخ چشت۔ از مولانا زکریا ص ۱۴۳ - سیر الاقطاب از الہدیہ - ص ۱۳۷ -

شامل ہیں۔[1]

نسب نامہ | تذکرۃ الانساب، خزینۃ الاصفیہ، اقتباس الانوار، اخبار الاخیار، احسن السیر، وقائع شاہ معین الدین چشتیؒ، رواءح المصطفیٰ اور رسالہ الانساب وغیرہ میں جو شجرے دیئے گئے ہیں اُن میں کچھ اختلافات ہیں۔ تحقیقی ترتیب کے مطابق حضرت خواجہؒ سے امام موسیٰ کاظمؒ تک "مراۃ الاسرار" میں (اس کا ایک قلمی نسخہ لندن کی برٹش میوزیم لائبریری میں ہے) اور حضرت موسیٰؒ کاظم سے لے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک "تذکرۃ السادات" میں (جو بڑی تحقیق سے بحکم سلطان ابوالظفر شاہ عالم بہادر شاہ مرتب کیا گیا ہے) مذکور ہے۔

اِن دونوں کتب کی روشنی میں شجرۂ نسب پدری اس طرح ہے:-

"خواجہ معین الدین حسن بن خواجہ غیاث الدین بن خواجہ نجم الدین طاہر بن سید عبدالعزیز بن سید ابراہیم بن سید ادریس بن سید امام موسیٰؒ کاظم بن امام جعفرؒ صادق، بن امام زین العابدینؒ بن امام حسینؓ بن سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ۔

شجرۂ نسب مادری اس طرح ہے:-

"حضرت بی بی اُمّ الورعؒ المعروف بی بی ماہ نور، وخاص الملک بنت سید داؤدؒ بن عبداللہ الحنبلی بن سید زاہد بن سید مورث بن سید داؤد بن سید موسیٰ بن سید عبداللہ بن سید حسن مثنیٰ بن سیدنا امام حسنؓ بن سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ۔ یہ شجرہ بقول "صاحب سالک السالکین جلد دوم، ص ۲۷۱، تواریخ آئینۂ تصوف میں بحوالہ ظہرت نامہ و مکتوب نظام" درج ہے۔

مقام ولادت | آپ کے مقامِ ولادت میں اختلاف ہے۔ مؤلف سیر العارفین نے آپ کا مولد سجستان لکھا ہے (فتوح البلدان جزو دوم میں زابلستان اور غزنی کے درمیان دریائے ہلمند کے نیچے کے علاقے کو سجستان اور بلخ تک کے اوپر کے علاقے کو طخارستان لکھا گیا ہے)، جغرافیہ خلافت مشرقی[2] کا بیان ہے۔ سیستان فارسی لفظ سنگستان سے ماخوذ ہے، عرب اسے سجستان کہتے ہیں۔ اس ملک کی زمین نشیب

---

[1] معین الارواح از خادم حسن ص ۹

[2] اس کا مصنف جی لی اسٹرینج ہے اور اس نے ۳۰۰ صفحات میں اس کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔

میں ہے اور جھیل زِرّہ کے گرد اور اس کے مشرق میں واقع ہے۔ دریائے ہلمند اور جس قدر دریا اس جھیل میں گرتے ہیں اُن سب کے ڈیلٹا اس زمین پر پڑتے ہیں۔ فارسی میں سیستان کو نیمروز یا جنوبی ملک بھی کہتے ہیں اور جنوبی ملک کہنے کی وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ سیستان خراسان کے جنوب میں واقع ہے۔ صوبہ سجستان کی زرخیزی مشہور ہے۔ ایرانی روایات میں سیستان اور زابلستان کی وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ رستم کے باپ زال کا وطن تھا اور رستم ایرانیوں کا قومی ہیرو تھا۔

بعض نے مقامِ ولادت اسنجار (متصل موصل) لکھا ہے۔ ڈاکٹر براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۲ صفحہ ۳۰۲ میں اسے سنجر (SANJAR) لکھا ہے اور اس کا محلِ وقوع ایشیائے کوچک لکھا ہے، جب کہ صاحب سالک السالکین نے بھی سنجر لکھا ہے اور اسے موصل سے تین دن کی راہ پر بتایا ہے[1] سنجر نام کے تین مقامات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک سنجر بغداد سے سات میل مغرب میں موصل کے قریب ہے۔ سلطان سنجر سلجوقی اسی جگہ پر پیدا ہوا تھا اور اس کا نام تماریک بھی تھا۔ دوسرا سنجر اصفہان میں ایک محلّے کا نام تھا جب کہ تیسرا سنجر صوبہ سیستان میں تھا اور اسی کو حضرت کا وطن کہا جاتا ہے۔ صوبہ سیستان ایران و افغانستان کی حدود کے درمیان نیشاپور سے دُور جنوب میں واقع ہے۔ صاحب معین العارفین نے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر کے ایک ہراتی طالب علم شیر گل خاں کے حوالے سے بتایا ہے کہ یہی حضرت کا وطن تھا۔ یہاں آپ کے خاندان کے افراد اب تک موجود ہیں۔ اس کے گرد پہاڑ ہیں اور یہاں پھل بکثرت پائے جاتے ہیں۔[2]

حضرت نواب خادم حسن صاحب معین الارواح کی تحقیق کے مطابق حسب سیر الاقطاب صحیح تر یہ ہے کہ آپ کا آبائی وطن سجزستان یعنی سنجر (سیستان) ہے۔ صاحب سالک السالکین نے سجستان کو سیستان کا معرّب بتایا ہے اور اس کا مخفف، سجز (س ج ز) لکھا ہے اور ہنری جارج کین نے نظر ثانی شدہ اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری بہ ضمن حالات ابوالفرح اسے سجز ہی لکھا ہے اور سیر الاقطاب ہی کے مطابق مقامِ ولادت صفاہان (اصفہان) ہے (صفحہ ۱۰۱) لیکن معلوم ہے کہ آپ کی بود و باش

[1] تاریخِ دعوت و عزیمت از ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۲۴ و معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۹
[2] تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی صفحات ۷۵ تا ۷۷، و معین الارواح از نواب خادم حسن صفحہ ۹

سنجان (سنج) میں رہی۔ (فتح البلدان جزو دوم حصہ ہشتم صفحہ ۸۵ پر جو نقشہ منسلک ہے اس میں علاقہ سجستان میں سنج کو دکھایا گیا ہے) یہی جگہ سنجر کے نام سے مشہور ہے اور بقول ابوالفضل یہ قصبہ (سجز) سیستان سے متعلق ہے (آئینِ اکبری، جلد دوم صفحہ ۶۲) اور اسی کی توضیح کرتے ہوئے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ رقمطراز ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی کی اصل نسبت "سجزی" ہے جو کاتبوں کی غلطی اور بولنے والوں کی غلط فہمی کی وجہ سے سنجری بن گیا۔ قدیم مسودات و اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں سجزی ہی لکھا اور بولا جاتا تھا۔ سجزی کی نسبت سجستان کی طرف ہے۔ قدیم جغرافیہ نویس اس کو عام طور پر خراسان کا ایک حصہ مانتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اس کا اکثر حصہ ایران میں شامل ہے اور باقی افغانستان میں۔ اس کا پایۂ تخت زرنج تھا جس کے کھنڈرات زاہدان کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں سجستان کی حدود غزنین تک تھیں۔ (احسن التقاسیم) بعض جغرافیہ نویسوں کے نزدیک "سجز" سجستان کے ایک خاص مقام کا نام ہے جس کی طرف نسبت سجزی آتی ہے۔ کبھی کبھی پورے سجستان کی طرف بھی سجزی کہہ کر نسبت کر دیتے ہیں۔[1]

رسالہ "احوال پیرانِ چشت" غالباً پہلا قدیم مسودہ ہے جس میں یہ لفظ صحیح لکھا ہوا ہے، پھر فتوح السلاطین کے اشعار بھی سجزی ہی سے موزوں ہوتے ہیں۔ ایک شعر ہے ؎

معین الدین آں سجزی دین پناہ
کہ رخصت بہ اجمیر آں مردِ راہ ٥

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی دان حضرات کا سجستان کے اس قصبے کو "سجز" کہنا صحیح ہے لیکن ترکوں نے سنجرستان کے اس قصبے کو "سنجر" کہا تو غلط نہیں کہا۔ اس مقام کے تلفظ پر اصرار کرنا علمیت کی نہیں، ضد کی بات ہے۔ یہاں کے باشندوں کو ان کی رعایت کی وجہ سے سنجری بھی کہا جا سکتا ہے اور سجزی بھی۔[2]

سنِ ولادت آپ کی ولادت کے مختلف سنین ۵۲۳ھ اور ۵۳۷ھ کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ۵۳۷ھ کو اگرچہ کثرتِ رائے حاصل ہے مگر مؤلف کلیات انصادقین مؤلف مرآۃ الاسرار نے (جس کا ایک قلمی نسخہ

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت از ابوالحسن علی ندوی
[2] سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ از ڈاکٹر احمد مسعود ٥ شعر کا وزن گرفت میں نہیں آیا۔ (ایڈیٹر)

رامپور کے سرکاری کتب خانے میں ہے) آپ کا بعمر ۹۷ سال ۶۲۷ھ میں وفات پانا لکھا ہے۔ اس حساب سے آپ کا سنِ ولادت ۵۳۰ھ نکلتا ہے۔ یہی سالِ ولادت مؤلف مراۃ الانساب صفحہ ۱۶۰ اور خاندانِ زبیر کنبوہی جلد اول صفحہ ۳۱۶ وغیرہ نے لکھا ہے۔ صاحب سیر الاقطاب نے ۶۲۳ھ کو سالِ وصال تسلیم کیا ہے اور "آفتاب ملک ہند" سے اس سن کا استخراج کیا ہے۔ سرمد علیہ الرحمۃ بھی اسی سن کے مؤید ہیں اور صاحب خزینۃ الاصفیا نے بھی یہی سالِ وصال مانا ہے، مگر نہ معلوم سید امیر علی نے اسپرٹ آف اسلام میں سالِ وصال ۶۶۳ھ / ۱۲۵۶ء کیسے لکھ دیا ہے؟—

پھر آپ کی عمر شریف کے متعلق بھی متعدد آرا ہیں، لیکن کسی کو تاریخی شہادت حاصل نہیں ہے۔ ستانوے، اٹھانوے اور سو برس تک کہی جاتی ہے۔ اس طرح اگر اسمائے حسنہ کی رعایت سے حضرت کی عمر ننانوے سال مان لیں تو اعتراض کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ممکن ہے یہی مبارک و مسعود بھی ہو۔ ننانوے برس کی عمر اور ۶۳۳ھ کو سنِ وصال طے کرنے کے بعد از روئے حساب ۵۳۴ھ کو سالِ ولادت ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مختلف وجوہات کی بنا پر نواب خادم حسن کی تحقیق اقرب الی الصواب ہے یعنی ۵۳۰ھ۔ مؤلف مرقعۂ خواجگان نے صفحہ نمبر ۱۱ پر بحوالہ "آئینہ تصوف" آپ کی تاریخ ولادت ۹ جمادی الثانی لکھی ہے۔ ۵۳۰ھ کی یہ تاریخ ۱۵ مارچ ۱۱۳۶ء سے مطابقت کرتی ہے۔[1]

نشو و نما اور ابتدائی تعلیم

آپ کا نشو و نما خراسان میں ہوا[2] (اسلامی فتوحات کے بعد کابل و قندھار سے لے کر ایران تک کا ملک خراسان کہلایا۔ جب ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی تختِ قندھار پر بیٹھا، اُس وقت اس کا نام افغانستان ہوا، مگر مغربی حصہ اب بھی خراسان کہلاتا ہے[3])۔ ابتدائی تعلیم سے متعلق کتابوں میں تفصیلات نہیں ہیں۔ مگر حال کے ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم آپ نے گھر پر ہی حاصل کی۔ ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا[4]۔ (مؤلف سیر العارفین نے بھی آپ کا دورانِ قیام سمرقند و بخارا

---

[1] یہ بحث معین الارواح از نواب خادم حسن صفحہ ۱۰ اور سوانح خواجہ معین الدینؒ چشتی از سید احمد مسعود سے ماخوذ ہے۔

[2] معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۱۲ — [3] خاندانِ زبیر کنبوہی جلد اول ص ۱۳

[4] سیر الاقطاب صفحہ ۱۵۱۔

میں قرآن حفظ کرنا لکھا ہے صفحہ نمبر ۵ ۔ بعض نے آپ کا نواحِ خراسان میں تعلیم پانا اور قرآن حفظ کرنا لکھا ہے۔ بعد ازاں آپ سنجر کے ایک مدرسے میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور تھوڑے ہی عرصے میں خاصا علم حاصل کر لیا۔[1]

یتیمی اور تقسیم ترکہ

آپ کو یتیمی کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔ ۱۵ شعبان سنہ ۵۴۴ھ مطابق سنہ ۱۱۵۰ء (جب کہ آپ کی عمر کا پندرھواں سال تھا) آپ کے والد غیاث الدین نے جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف سفر اختیار فرمایا۔[2] ایک سال کے اندر ہی والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں[3]۔ آپ کے والد کا مزار بغداد کے محلے "دروازہ شام" (بغداد میں باب شام شمال میں کاظمیہ کے رُخ پر واقع ہے[4]) میں ہے۔ یہ ایک پختہ مگر بوسیدہ حجرے میں ہے اور زیارت گاہِ خلائق ہے۔

والد گرامی کے وصال کے بعد جب ترکہ تقسیم ہوا تو آپ کے حصے میں ایک باغ اور ایک پن چکی آئی۔ یکہ و تنہا باغ کی نگرانی خود کیا کرتے تھے اور اسی آمدنی سے گزر بسر کرتے تھے[5]۔

شیخ ابراہیم قندوزی سے ملاقات

شروع ہی سے آپ کا مزاج فقر دوست تھا اور درویشوں کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔ شعبان سنہ ۵۴۴ھ میں ایک دن (جب کہ عمر کا پندرھواں سن چل رہا تھا) آپ باغ کو سیر فرما رہے تھے کہ ابراہیم قندوزی مجذوب کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپ نے انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا اور خوشۂ انگور سے اُن کی تواضع کی۔ مجذوب اس خلوص سے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ایک کھل کا ٹکڑا بغل سے نکالا اور دانت سے کاٹ کر آپ کو دیا۔ اُس کو کھانے سے آپ کا قلب دُنیا سے سیر ہو گیا۔ باغ اور پن چکی فروخت کر کے قیمت موصولہ فقرا و مساکین میں تقسیم کر دی اور خود طلبِ حق میں سفر اختیار

---

[1] ہولی سینٹ آف اجمیر از الحاج محمد علی سالمین صفحہ ۲۲ بحوالہ معین الارواح صفحہ ۱۲۔

[2] سوانح خواجہ معین الدین چشتی از وحید احمد مسعود صفحہ ۸۰، ۸۱ ۔ معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۱۲۔

[3] سوانح خواجہ معین الدین چشتی از وحید احمد مسعود صفحہ ۸۰۔

[4] مقالہ ۔ بغداد ۔ از کرنل بھولا ناتھ مطبوعہ ماہنامہ الناظر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۲۔

[5] سیر العارفین صفحہ ۵، معین الارواح صفحہ ۱۲، سوانح خواجہ معین الدین چشتی صفحہ ۸۱۔

فرمایا۔[1]

اسفار و امصار کا جائزہ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات مصروف کا بیشتر حصہ سفر و سیاحت میں گذرا ہے بلکہ اگر اسے کاملاً "سیروا فی الارض" کا نمونہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔

آپ کی سفری زندگی کا آغاز ۵۴۴ھ سے ہوتا ہے، جب کہ حضرت ابراہیم قندوزیؒ سے ملاقات کے بعد تلاشِ حقیقت کی جستجو آپ میں پیدا ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے آپ سمرقند و بخارا گئے اور وہاں تحصیلِ علم کیا۔ ۵۵۵ھ میں آپ عراق تشریف لائے اور یہاں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (ولادت ۴۹۱ھ) سے ملاقات کی۔ اُس وقت آپ کی عمر تقریباً اکیس سال تھی۔ کہا جاتا ہے بغداد میں ملاقات کی جگہ اب بھی محفوظ ہے۔ عراق سے آپ حرمین روانہ ہوئے، یہاں سے واپسی پر ہارون (چراغ دہلویؒ نے خیر المجالس میں اسے ہروَن لکھا ہے) تشریف لائے اور حضرت خواجہ عثمانؒ[2] ہارونیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعتِ سلسلہ کی۔ ڈھائی برس تک مرشد کی خدمت میں مصروفِ مجاہدہ رہے اور صاحبِ اجازت ہوئے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔[3]

ہارون سے واپس بغداد تشریف لائے۔ اِس موقع پر آپ نے شیخ ابو نجیب سہروردیؒ سے ملاقات کی۔ بعد ازاں آپ شام اور پھر کرمان تشریف لے گئے۔ آپ ایک سے زائد مرتبہ ہندوستان تشریف لائے۔ (یہ ایک اختلافی بحث ہے)۔ تبریز، آستر آباد، بخارا، حرقان، سمرقند، میمنہ اور پھر ہرات سے ہوتے ہوئے آپ ملتان تشریف لائے۔ یہ ہندوستان میں آپ کی پہلی آمد تھی۔ ملتان سے آپ دارالسرور گئے۔ اس ورود کے موقع پر آپ اجمیر نہیں گئے۔

---

[1] معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۱۲، وحید احمد مسعود صفحہ ۸۲، ۸۳۔ آبِ کوثر از بشیر احمد اکرم صفحہ ۱۹۹، تذکرۂ خواجگانِ چشت از شیخ الہدیہ ص ۱۳۷۔

[2] آپ کا اسم گرامی عثمانؒ، کنیت ابو النور اور لقب چشتی ہے۔ آپ ۵۲۹ھ میں قریہ ہارون میں پیدا ہوئے اور اکاسی برس کی عمر میں ۶۱۱ھ میں وفات پائی۔ خواجہ شریف زندنیؒ سے بیعت تھے۔ آپ کی سیرت پر بہترین تصنیف نواب خادم حسن صاحب کی کتاب "ذکرِ عثمان" ہے جسے اگست ۱۹۴۸ء میں خادمی پریس اجمیر نے شائع کیا۔

[3] سیر العارفین صفحہ ۷، فرشتہ ترجمہ اردو جلد ۲ صفحہ ۵۷۰، مسالک السالکین جلد ۲ صفحہ ۲۷۲، بحوالہ معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۱۴۔

جس وقت آپ لاہور تشریف لائے وہاں بہرام شاہ کا پوتا خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی حکومت کرتا تھا۔ لاہور میں آپ دو ہفتے تک شیخ علی ہجویری (م ۴۶۵ھ) کے مزار پر معتکف رہے (تذکرۂ اولیائے ہند کے صفحہ ۸ پر مدتِ اعتکاف دو ماہ لکھی ہے) آپ کا حجرۂ اعتکاف اب تک موجود ہے۔ رخصت کے وقت آپ نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما [1]

لاہور کے بعد آپ بلخ اور استر آباد سے ہوتے ہوئے بغداد واپس چلے گئے۔

۵۶۲ھ تا ۵۸۲ھ کا زمانہ آپ کے اسفار کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ اس دوران آپ اپنے مرشد کے ہمراہ حرمین تشریف لے گئے۔ واپسی پر آپ نے مرشد کے ساتھ سیوستان، دمشق اور سنجار کا سفر کیا۔ یہاں سے پھر ۵۸۱ھ میں حرمین کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسی دور میں سنجار میں شیخ نجم الدین کبریٰ (م ۶۱۶ھ) سے ملاقات کی۔ کوہِ جودی کے دامن میں واقع مقام جیل میں آپ نے دوسری مرتبہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملاقات کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۰ برس اور شیخ کی عمر تقریباً ۹۰ سال تھی۔

۲ سال تک مرشد کی خدمت کرنے کے بعد آپ بغداد میں مرشد سے رخصت ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۲ سال تھی۔ اس موقع پر خواجہ عثمانؒ ہارونی نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس طرح ۵۸۲ھ میں مرشد سے رخصت ہونے کے بعد آپ اصفہان تشریف لائے۔ یہاں آپ نے خواجہ قطب الدین بختیارؒ کاکیؒ کو مرید کیا۔ خواجہ بختیار کاکی خواجہؒ صاحب کے ہمراہ سفر حرمین کے لیے روانہ ہوئے۔ ۵۸۳ھ میں آپ حرمین میں تشریف لائے تو دربارِ رسالتؐ سے آپ کو نومی بشارت کے ذریعے اجمیر جانے کا حکم دیا گیا۔ بعدازاں آپ اجمیر روانہ ہوئے۔

چشتیہ کی وجہ تسمیہ | یہ خیال غلط ہے کہ چشتیہ سلسلہ خواجہ معینؒ الدین چشتی سے شروع ہوا۔ در اصل چشت

---

[1] مسالک السالکین جلد دوم صفحہ ۲۷۸ اور خزینۃ الاصفیا، جلد دوم صفحہ ۲۳۳ پر شعر کا آخری لفظ رہنما کے بجائے پیشوا لکھا ہوا ہے۔

[2] تذکرہ خواجگانِ چشت از شیخ الہدیہ ص ۱۴۲، ۱۴۳۔

خراسان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ وہاں کچھ بزرگانِ دین نے رُوحانی اصلاح و تربیت کا ایک بڑا مرکز قائم کیا تھا۔ جسے بڑی شہرت حاصل ہوئی اور وہ نظام اس مقام کی نسبت سے چشتیہ سلسلہ کہلانے لگا۔ مولانا رحیم بخش نے شجرۃ الانوار میں لکھا ہے۔ چشت نام کے دو مقام ہیں۔ ایک شہر خراسان میں ہرات کے قریب واقع ہے۔ دوسرا چشت ہندوستان میں (یہ تقسیم ہند سے قبل کی تحریر ہے) اوچ اور ملتان کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ خواجگانِ چشت خراسان والے چشت سے تعلق رکھتے ہیں[۱]

سلسلۂ چشتیہ کی ابتدا حضرت خواجہ ابواسحٰقؒ سے ہوئی جب آپ بقصدِ حصولِ بیعت حضرت خواجہ ممشاد علو دینوریؒ کی خدمت میں بغداد میں حاضر ہوئے اور شرف بیعتِ ارادت سے مشرف ہوئے تو حضرت خواجہ ممشاد علو دینوریؒ نے دریافت فرمایا تیرا نام کیا ہے؟ عرض کیا اس عاجز کو ابواسحاق شامی کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا آج سے ہم تجھ کو ابواسحٰق چشتی کہیں گے۔ جو تیرے سلسلۂ ارادت میں تا قیام قیامت داخل ہوگا وہ بھی چشتی کہلائے گا۔ پس خواجہ ابواسحٰقؒ شامی حسب فرمانِ مرشد رشادِ فلاں تشریف لائے جو ہرات سے ۳۰ کوس کے فاصلے پر ہے اور رشد و ہدایت میں مصروف ہوئے۔ آپ کے سلسلے کے بزرگوں میں سے خواجہ ابواحمد چشتیؒ، خواجہ محمد چشتی، خواجہ ابویوسف چشتی، اور خواجہ قطب الدینؒ مودود چشتی⁰ بھی چشت میں قیام پذیر ہوکر مدفون ہوئے سو یہ سلسلہ چشتی کے نام سے مشہور ہوا۔ چونکہ مذکورہ بالا حضرات اجمیری کے پیرانِ سلسلہ ہیں، اس لیے خواجہ معین الدینؒ حسن بھی چشتی کہلائے[۲]

بہت سے دیگر روحانی سلسلوں کی طرح سلسلہ چشتیہ بھی حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے شروع ہوتا ہے۔ مشہور اسمائے مشائخ یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب ۲۔ خواجہ حسن بصری۔ ۳۔ خواجہ ابوالفضل عبدالواحد ابن زید ۴۔ خواجہ ابوالفیض فضیل بن عیاض۔ ۵۔ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھم بلخی۔ ۶۔ خواجہ سدید الدینؒ حذیفہ المرعشی۔ ۷۔ خواجہ امین الدینؒ ابی ہبیرہ البصری۔ ۸۔ خواجہ ممشاد علو دینوری۔ ۹۔ حضرت خواجہ ابواسحاق شامی چشتی۔

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی صفحہ ۱۳۷

[۲] مسالک السالکین جلد دوم صفحہ ۱۹۶ ۔ معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۱۱

⁰ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نسب انہی سے مربوط ہے۔ (ایڈیٹر)

۱۰۔ حضرت خواجہ ابی احمد ابن فرسنافہ چشتی۔ ۱۱۔ خواجہ ابی محمد ابن احمد چشتی۔ ۱۲۔ حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی۔ ۱۳۔ حضرت خواجہ مودود چشتی۔ ۱۴۔ خواجہ حاجی شریف زندنی۔ ۱۵۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی۔ ۱۶۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

فتوح السلاطین ہندوستان کے مذہبی اور غیر مذہبی لٹریچر میں پہلی کتاب ہے جس میں مشائخ چشت کا شجرہ نظم کیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب الانتباہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چشتیہ سلسلہ حسن بصری کے ذریعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک نہیں پہنچتا، اس لیے کہ حسن بصریؒ اس وقت خورد سال تھے اور وہ خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن شاہ فخر الدین دہلویؒ نے جو شاہ ولی اللہ کے معاصر تھے، اس خیال کی تردید کی ہے اور ایک کتاب فخر الحسن لکھی ہے جس میں حسن بصریؒ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خلافت پانا ثابت کیا ہے۔ اس کتاب کی شرح مولانا احسن الزمان حیدر آبادی نے "قول المستحسن فی شرح فخر الحسن" کے نام سے عربی میں لکھی ہے۔[1]

اجمیر میں آپ کی آمد "اجمیر" قلب راجستھان میں اسی نام کی ایک سابقہ نیم خود مختار ریاست کا پایۂ تخت، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہندوؤں کا ایک راجہ جس کی عملداری کی سرحد تک راجدھانی تھی۔ اس کا نام "آجا" تھا جس کے معنی ہندی میں آفتاب کے ہیں اور "میر" ہندی میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ ہندوؤں کی تواریخ میں لکھا ہے کہ ہندوستان پر سب سے پہلے پہاڑوں پر جو دیواریں بنائی گئیں ان میں سے یہی وہ دیوار ہے جو کوہ اجمیر کے اوپر ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں جو سب سے پہلا حوض بنایا گیا۔ وہ "پشکر" کا حوض ہے جو اجمیر سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے اور تمام ہندو اس کی پوجا کرتے ہیں اور ہر سال چھ دن تک "تحویل عقرب" کے موقع پر یہاں اکٹھے ہو کر نہاتے ہیں۔

اجمیر کی شہرت خواجہ صاحبؒ کے مزار کی وجہ سے ہے۔ اس مقبرے کو سلاطین مالوہ نے ۱۴۵۵ء کے کچھ ہی بعد تعمیر کرایا تھا۔ گو ملحقہ عمارتیں بعد میں بنیں، جن میں سے دو مساجد اکبر اور شاہجہان کی تعمیر کردہ ہیں۔ آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم عمارت "ڈھائی دن کا جھونپڑا" ہے جو دراصل ایک قدیم درسگاہ تھی جسے بعد میں مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔[2]

اس شہر کی بنیاد راجپوت راجہ "اجے چوہان" نے ۱۱۰۰ء کے قریب ڈالی تھی۔ ۱۱۹۲ء میں غوری نے اسے فتح کر لیا اور ۱۱۹۵ء میں قطب الدین ایبک نے اسے سلطنت دہلی کا جزو بنا دیا۔ ۱۳۹۶ء سے کچھ ہی عرصے بعد مواڑ کے راجپوتوں

---

[1] تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی صفحہ ۱۳۵ تا ۱۴۱

[2] اخبار الاخیار از شیخ عبدالحقؒ صفحہ ۱۶۱، تذکرہ خواجگان چشت از شیخ الہدیہ ۱۴۹۔

نے اجمیر کو پھر چھین لیا۔ لیکن ۱۴۵۵ء میں مالوے کے سلاطین نے انھیں وہاں سے نکال دیا۔ اور شہر پر ۱۵۳۱ء تک قابض رہے۔ اسی سال مارواڑ کے راجہ مالدیو نے اجمیر پر اپنا تسلط جما لیا۔ اکبر نے اپنی سلطنت کے ابتدائی سالوں میں اجمیر کو اپنی قلمرو میں ضم کر کے اسے اسی نام کے ایک صوبے میں ضم کر دیا۔ چونکہ یہ چاروں طرف سے راجپوت ریاستوں میں گھرا ہوا ہے اور مالوہ اور گجرات کے راستے پر واقع ہے اس لیے اجمیر جلد ہی حرب اور تجارت کے نقطۂ نظر سے ایک اہم مرکز بن گیا۔ اُدھر اکبر نے خواجہ صاحب کے مزار کی زیارت کے لیے متعدد سفر کیے جس سے اجمیر ایک اہم زیارت گاہ بن گیا۔ ۱۷۲۱ء کے بعد اجمیر پہلے راجپوتوں کے تصرف میں آیا اور پھر مرہٹوں کے، جنھوں نے ۱۸۱۸ء میں اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا[1]

بہر کیف اشارۂ جناب رسالتمآبؐ کے بموجب آپ ۵۸۷ھ میں چالیس رفقاء کے ہمراہ بعہد پرتھوی راج ۵۷۲ھ تا ۵۸۸ھ (۱۱۷۷ء تا ۱۱۹۳ء)[2] (جو پندرہ سال حکومت کر کے ۵۸۸ھ میں مارا گیا۔ (احسن السیر ص ۱۲) وارد اجمیر ہوئے اجمیر میں یہ آپ کا پہلا ورود تھا۔[3] اس وقت آپ کی عمر ۵۲ برس تھی۔ وارد اجمیر ہونے کی تاریخ فرشتہ نے ۱۰ محرم لکھی ہے[4]

قیامِ اجمیر کے ابتدائی عرصے ہی میں اجمیر کے "جوگیٔ اعظم" اجے پال نے اسلام قبول کر لیا۔ جن کا نام سوری رکھا گیا۔ ۵۸۷ھ ہی میں آپ نے پرتھوی راج کی گرفتاری کی پیشگوئی کی اور اسی سال عالمِ رویا میں شہاب الدین غوری کو مژدۂ کامرانی سنایا۔ بعد ازاں پرتھوی راج کو شکست دے کر غوری ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ء میں اجمیر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس وقت قاضی حمید الدین ناگوری بھی اجمیر میں موجود تھے۔ آپ نے شہاب الدین غوری کو شرفِ مریدی سے باریاب فرمایا۔[5]

آپ کی ازدواج و اولاد[6] آپ کا پہلا نکاح بی بی امۃ اللہ سے ہوا جن کے بطن سے خواجہ فخر الدینؒ ابو الخیر، خواجہ حسام الدین ابو سعید اور بی بی حافظؒ جمال تولد ہوئیں۔ یہ نکاح ۵۹۱ھ مطابق ۱۱۹۵ء میں ہوا۔ آپ کا دوسرا نکاح بی بی عصمتؒ اللہ کے ساتھ ۶۲۰ھ مطابق ۱۲۲۳ء میں ہوا۔ ان کے بطن سے خواجہ ضیاء الدینؒ ابو صالح پیدا ہوئے۔

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ اردو جلد ۱ ص ۱۰۱۱-۱۰۱۲۔ [2] اجمیر ہسٹوریکل اینڈ ڈسکرپٹو صفحہ ۱۴۶

[3] معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۱۳۹۔ [4] سوانح خواجہ معینؒ الدین چشتی از حمید احمد مسعود ص ۱۳۹ تا ۱۴۷

[5] معین الارواح صفحہ ۴۸۔

[6] سیر العارفین ص ۱۶۔ سیر الاقطاب صفحہ ۱۳۴، احسن السیر صفحہ ۱۵۹۔ تذکرہ خواجگانِ چشت از شیخ الهدیہ ص ۱۵۱ تا ۱۵۲

خواجہ فخر الدین اور خواجہ ضیاؒ کا مزار اجمیر میں اور خواجہ حسام الدینؒ کا مزار ناظم آباد کراچی کے قریب ہے۔

آپ کے خلفاء یوں تو آپ کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے تین نام ایسے ہیں جنہوں نے آپ کے سلسلے کو چار چاند لگائے ہیں:

۱۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ۔ ۵ رمضان ۶۱۱ھ کو خواجہ صاحب نے آپ کو خلافت عطا کی۔ آپ ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۵ سال کی عمر میں ۶۷۰ھ میں انتقال فرمایا۔[۱]

۲۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ آپ سادات حسینی سے ہیں۔ آپ کی ولادت ۵۵۹ھ میں ہوئی۔ ۵۷۶ھ میں ۱۷ سال کی عمر میں بغداد میں مشرف بہ خلافت ہوئے۔ آپ کا وصال ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ میں ہوا۔[۲]

۳۔ حمید الدینؒ ناگوری۔ آپ ندان ناگور (علاقہ جودھپور) کے رہنے والے تھے۔ حضرت سعد بن زیدؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ نے ۱۰۴ سال کی عمر میں ۶۷۲ھ میں وفات پائی۔

وفات و تدفین شب ششم رجب ۶۲۷ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۲۳۰ء بروز دوشنبہ بعد نماز عشاء آپ نے حجرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اور خدام کو اندر آنے کی ممانعت فرمائی۔ خدام حجرے کے باہر موجود رہے۔ ان کے کانوں میں تمام شب صدائے وجد آتی رہی۔ آخر شب میں وہ صدا بند ہو گئی۔ جب صلوٰۃ فجر کا وقت آیا اور حجرے کا دروازہ حسب معمول نہیں کھلا تو دروازہ توڑ کر دیکھا گیا تو آپ واصل بحق ہو چکے ہیں اور جبیں مبارک پر بخط قدرت "ھذا حبیب اللّٰہ مات فی حب اللّٰہ" مرقوم ہے۔ ؎

چمنے کہ تا قیامت گل او بہار بادہ
صنمے کہ بر جمالش دو جہاں نثار بادہ (جامیؒ)

---

۱ معین الارواح از خادم حسن صفحہ ۶۰ ۔ تاریخ مشائخ چشت از خلیق نظامی ص ۱۵۶ تا ۱۶۲۔

۲ ایضاً 〃 ۶۳ 〃 〃 〃 ۱۵۰ تا ۱۵۶

۳ 〃 〃 ۶۳ اخبار الاخیار از عبدالحق صفحہ ۶۷ تا ۹۰

۴ 〃 〃 ۶۶ تذکرہ خواجگان چشت از شیخ الہدیہ صفحہ ۱۵۵ ۔ تاریخ مشائخ چشت از مولانا ذکریا ص ۱۷۰ ۔ اخبار الاخیار از شیخ عبدالحقؒ ص ۵۱۔

رسائل و مسائل

امام مہدی

شیخ الحدیث مولانا عبد المالک صاحب منصورہ

سوال:- آج کل میں ایسی جگہ آ گیا ہوں جہاں ایک خاص فرقہ کے لوگ کثرت سے ہیں۔ یہ لوگ مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں آتے، بلکہ اُن کے پیچھے نمازیوں سے تمسخر کرتے ہیں۔ یہاں اہل سنت والجماعت بہت کم ہیں۔ مسجدوں میں صرف غیر سعودی ہی نظر آتے ہیں۔ مقامی لوگ بہت کم ہیں۔ یہ بھی دین کی راہ میں ایک فتنہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری رہبری فرمائے۔

یہاں مہدی علیہ السلام کا اکثر ذکر ہوا کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مہدی علیہ السلام کب کے ظہور ہو چکے ہیں، اور کوئی کہتا ہے کہ ابھی ظہور نہیں ہوا۔ میں نے بھی قرآن مجید میں یہ پڑھا تھا کہ قیامت سے قبل عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ آپ میری راہبری فرمائیں۔

جواب:-

"امام مہدی" کے بارے میں سوال پر مشتمل آپ کا خط ملا۔ دراصل لوگوں نے امام مہدی کے متعلق یہ تصور اپنے ذہنوں میں قائم کیا ہوا ہے کہ وہ کسی نبی کی طرح ظہور کرے گا، مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں کچھ کرامات دکھلائے گا۔ لوگ اسے مہدی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت میں ان چیزوں میں سے کوئی بھی چیز درست نہیں ہے۔ امام مہدی بھی مسلمانوں کے راہنماؤں کی طرح ایک عظیم راہنما ہوں گے۔ صاحب علم و فضل اور متصف بہ جرأت و شجاعت ہوں گے۔ لوگ اُن کے علم و فضل اور کام سے متاثر ہو کر اقامتِ دین کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں گے۔ اور وہ زبردست جہاد کے ذریعہ زمین سے طاغوتی قوتوں کے اقتدار کو ختم کر کے "حکومت الٰہیہ" کا نظام قائم کریں گے۔ احادیث میں اس طرح کے "امام مہدی" کے بارے میں جو پیشنگوئی کی گئی ہے

اس کا مصداق وہی شخص ہوگا جس کی قیادت میں مسلمان اللہ کے دین کو تمام باطل ادیان پر غالب کر دیں گے۔ اور اس کام کے ہو جانے کے بعد ہی یقینی طور پر کہا جاسکے گا کہ اس امام مہدی کا ظہور ہوگیا جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشینگوئی فرمائی تھی۔

اس امام مہدی سے پہلے اقامتِ دین کی تحریک برپا کرنے والے قائدین بھی بہر حال اسی زمرے میں شامل ہیں۔ اور احادیث میں اُن کے فضائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن "مہدی اعظم" ایک ہی ہوں گے اور وہ چالیس سال تک رہیں گے۔ ان کے آنے کے ۳۰، ۳۵ سال بعد حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ امام مہدی کے آخری دور میں دجّال کا ظہور ہوگا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام اسے قتل کریں گے۔ اس کے بعد پانچ یا سات سال تک مہدی اور عیسٰی علیہ السلام دونوں زندہ رہیں گے۔ پھر مہدی فوت ہو جائیں گے۔ اور عیسٰی علیہ السلام قتلِ دجّال کے بعد چالیس سال تک زمین میں رہیں گے۔ ان دونوں زمانوں کی خصوصیت یہ ہوگی کہ پوری زمین پر عدل وانصاف کی حکومت ہوگی۔ زمین اپنی برکات اور خزانے نکال دے گی۔ کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا۔ لوگوں کے درمیان آپس میں بغض وعداوت قطعاً نہ رہے گی۔ ہاں مہدی کے آخری زمانے میں دجّال اکبر کا فتنۂ عظیم سوائے مکّہ اور مدینہ اور بیت المقدس اور کوہ طور کے سارے عالم پر چھا جائے گا اور یہ فتنہ دُنیا کے تمام فتنوں سے عظیم ہوگا۔ دجّال کا قیام اور فساد صرف چالیس دن رہے گا۔ اور عیسٰی علیہ السلام کے دور میں یاجوج ماجوج کا ظہور ہوگا اور پھر وہ عیسٰی علیہ السلام کی دُعا سے بیماری کی وبا میں ہلاک ہو جائیں گے۔ دجّال اور یاجوج ماجوج کے فتنوں کے چند دنوں کے سوا مہدی اور عیسٰی علیہ السلام کا دور رحمت و برکت اور عدل وانصاف اور خوشحالی کا دور ہوگا۔ (ماخوذ از معارف القرآن جلد ۵ - ص ۲۳۵-۲۳۶)

مزید معلومات کے لیے آپ مولانا مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "تجدید و احیاءِ دین" کا مطالعہ فرمائیں۔ انشاء اللہ اطمینان ہو جائے گا۔

تصحیح - شمارہ اکتوبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۵۹، سطر ۱۴ میں قارئین "مفاد پرست" کی جگہ "خدا پرست" لکھ لیں۔ (ادارہ)

مطبوعات

ENCOUNTER | مدیر: البشیر اے، قریشی صاحب - مقام اشاعت: قصہ خوانی بازار پشاور

قیمت فی شمارہ: پاکستان میں ۵/- روپے - بیرون پاکستان (ترسیل بذریعہ ہوائی ڈاک) ۱ ڈالر امریکی

رزم گاہِ تاریخ میں اس ماہنامے کا ظہور گویا "بلہ برخیز" کی پکار ہے - قریشی صاحب جو مشکل ادوار میں پی پی آئی میں ذمہ دارانہ خدمات انجام دے چکے ہیں، اپنی فرض شناسی اور قابلیت کی بنا پر وقائع صحافت میں بڑے مقامِ ثقاہت و اعتبار تک پہنچے - ہمیں خوشی ہے کہ اس دور میں جبکہ صحافت (اخبار نویسی + صحیفہ نگاری) ایک صنعت اور کاروبار بن چکی ہے، قریشی صاحب نے (ENCOUNTER) کا اجرا بڑا واضح پیغام و مقصد سامنے رکھ کر کیا ہے - وہ ہے اسلام کے عالمی پیغام کو پھیلانا جس کے نتیجے میں انسانیت کو کسی طرح کی رخنہ اندازی کے بغیر مکمل امن حاصل ہوتا ہے - اس پیغام کا اوّلین تقاضا خداوند تعالیٰ کے حضور میں بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔

پہلے شمارے میں نہایت اہم موضوعات پر ابوالحسنین محمد یوسف علی، ڈاکٹر محمد باقر، فضیلت افضل، سیّد اسعد گیلانی، شاکر رضوانی، خواجہ امجد سعید اور مریم جمیلہ کی تحریریں شامل ہیں - دوسرا شمارہ موصول ہو چکا ہے جس سے اعتماد بڑھتا ہے کہ اس میگزین کی بنیاد مضبوط ہوگی۔

انگریزی میں اسلامی نقطۂ نظر سے اصولی اور عملی مسائل سے تعرض کرنے والے اس تحریک انگیز رسالے کو خدا ترقی دے۔

روس کے مسلمان | از جناب ثروت صولت - بہ اہتمام ادارہ معارفِ اسلامی کراچی - ناشر: مکتبہ تعمیرِ انسانیت اردو بازار لاہور ۲ صفحات: ۳۲۸ مجلد - قیمت: ۳۹/- روپے

روس ہمارا ہمسایہ ملک ہے اور ہمارا کوئی تاریخی یا نسلی عناد اس سے نہیں ہے - البتہ روس

ایک ایسا نظریہ حیات لے کے اُٹھا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ماننے والے لوگ مذہب کے وجود کو دُنیا سے ملیامیٹ کر دیں۔ خصوصاً اسلام کو جو سخت جان بھی ہے اور تحریک انگیز بھی۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ رُوس میں مسلمان پہلی صدی ہجری ہی سے بڑھنے لگے۔ پھر رُوس کے وسیع خطّے میں مسلمان حکومتیں قائم ہوئیں۔ اور پچھلی صدی کے وسط تک چلتی رہیں۔ پھر جب ان پر ماسکو کے روسیوں نے حملے شروع کیے تو انہوں نے لمبے عرصے تک جہاد جاری رکھا۔ غرضیکہ زارِ رُوس کی سلطنت کا ایک تہائی حصّہ مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد سے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اُن کو دبانے اور ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی جس کے بالمقابل ۱۹۰۵ء سے مسلمانوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ مگر انقلاب ۱۹۱۷ء نے سارا نقشہ بدل ڈالا۔ اس تبدیلی کے باوجود مسلمانوں کے لیے ظلم و استبداد میں مزید اضافہ ہوگیا۔ مسلمانوں کے کمیونسٹوں کے خلاف بھی اپنی رہی سہی بکھری طاقتوں کے بل پر جہاد کیا۔ وہ شکست کھا کر بڑے لمبے دورِ مظلومی سے گذرے۔ لیکن خدا کی عجیب شان ہے کہ آج بھی مسلمانوں کی اکثریت چند مخصوص شعائرِ اسلامی کے سہارے قائم ہے۔

آج رُوس کو ایک تو سپر پاور ہونے کی حیثیت سے امریکہ کے مقابلے میں اپنا مقام بنانا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ کم سے کم ایشیا کے قریبی علاقوں کو گرفت میں لیا جائے۔ دوسرے رُوس کو یہ اندیشہ بھی ہے کہ ایران سے پاکستان تک پھیلی ہوئی مسلم آبادی میں چونکہ اسلام کے لیے حرکت آفریں ایمانی جذبات موجود ہیں۔ اس لیے یہ علاقہ خود روسی مسلمانوں میں اسلامی تحریک پیدا کر کے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے، لہٰذا رُوس نے پروگرام یہ بنایا کہ اس علاقے پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ پہلا نشانہ افغانستان کو بنایا گیا ہے، لیکن افغان مجاہدین نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود ایک سپر پاور سے طویل جنگ لڑ کر جو مثال قائم کی ہے اس نے دُنیا کو حیران کر دیا ہے۔ بعد کے دو نشانے پاکستان اور ایران ہیں۔ مزید خطرہ ترکی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی حفاظت فرمائے۔

ثروت صولت صاحب کی کتاب میں چند سبق ہیں۔ ایک یہ کہ روسیوں کے ہتھکنڈے کیا ہوتے ہیں اور مظالم کی حد کہاں تک پہنچتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں نے پہلے رُوس کے علاقوں میں اور اب افغانستان میں جو مجاہدانہ کارروائیاں کی ہیں اُن کے لیے ایمانی، تنظیمی اور مادی لحاظ

سے کیا کچھ کیا جا سکا اور کیا کیا کمی کوتاہی رہی۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ روسی علاقوں میں مسلمانوں کے جہاد کی ناکامی کے اسباب کیا تھے اور مسلمانوں کے اتحاد میں کیسی کیسی معمولی چیزیں رخنہ پیدا کردیتیں اور اُن کے باہمی اختلافات کس طرح ان کی قوت کو برباد کردیتے۔ چوتھا سبق یہ کہ مسلمانوں کو زیادہ نقصان اُن کے اندر سے اُٹھنے والے غداروں نے پہنچایا۔ جنہوں نے ذرا ذرا سے فائدوں کے لیے دین و ملت کو دشمنوں کے ہاتھ فروخت کردیا۔

ع باپشیزے دین و ملت را فروخت

یہ کتاب اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ثروت صولت صاحب "تاریخ نویسی کے فن میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ اہلِ پاکستان کے لیے جغرافی، سیاسی اور دفاعی حیثیت ہی سے نہیں، دینی ضرورت سے بھی اس کتاب کو پڑھنا چاہیے۔

سندھ کے موجودہ حالات اور ہماری ذمہ داریاں	از جناب محمد موسیٰ بھٹو۔ ناشر: صدیقی ٹرسٹ، نسیم پلازا، لسبیلہ روڈ، کراچی۔ ہدیہ (بطور صدقہ جاریہ) ایک روپیہ۔

یوں تو بات ایک پمفلٹ کی ہے۔ مگر اس میں ہمارے لیے ایک اہم انتباہ ہے۔ سندھ وہ مبارک خطہ ہے جو اسلام کے لیے ہندوستان میں داخلے کی گذرگاہ بنا اور جہاں کے لوگوں نے رضاکارانہ جذبے سے اسلام کو لبیک کہا۔ بعد کے ادوار کی اسلامی تحریکوں کی تاریخ کا رشتہ بھی سندھ سے جا ملتا ہے۔ لیکن اب اسی صوبہ میں ایک طرف روس اپنی سازش کاریوں کے جال پھیلا کر کمیونزم کا دانہ ڈال رہا ہے اور دوسری طرف بھارت اپنی دسیسہ کاریوں سے کام لے کر سندھ کو دینی طور پر اسلام سے اور سیاسی طور پر پاکستان سے کاٹ لے جانا چاہتا ہے۔ اور تیسری طرف ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم اپنے سندھی بھائیوں کو اغیار سے بچانا تو کجا، خود اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ان کو اور دور دھکیل رہے ہیں۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ ہماری غلطیوں ہی نے دوسروں کو رخنہ اندازی کا موقع دیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ سندھ میں کمیونسٹ لٹریچر اور بھارتی پروپیگنڈہ دونوں نہ صرف ایسی معلوماتی کتب مہیا کر رہے ہیں۔ بلکہ شعر و افسانہ کے لیے لٹریچر کا بھی سیلاب برپا کر رہے ہیں جو سندھیوں میں اسلام اور پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے والا ہے۔ الحاد اور

مذہب دشمنی کا زہر دماغوں میں اُتار رہا ہے۔ اور رندی و ہوسناکی کی لہریں دُنیا کے جذبات میں اُٹھا رہا ہے۔ خدانخواستہ دشمنوں کے تیور ویسے ہی لگتے ہیں جیسے ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دو لخت کرنے کا باعث ہوئے تھے۔

اس کے جواب میں نہ قومی پیمانے پر ہم سندھی بھائیوں کی شکایات کا حل کرنے یا برادرانہ انداز سے افہام وتفہیم کرنے کے لیے کوئی اقدام کر سکے ہیں، نہ حکومت کی طرف سے خطرے کے پورے جائزے کے تحت دور رس منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی کام ہو رہا ہے اور نہ محبِ وطن جماعتوں اور اداروں کی طرف سے اتنا مؤثر اور معتدبہ لٹریچر سندھی میں آ رہا ہے جو تخریبی افکار کے طوفان کا مقابلہ کر سکے اور سندھیوں، خصوصاً ان کے نوجوانوں کو اصل دشمن قوتوں کی شرانگیزیوں کے متعلق چوکنا کر سکے۔ مصیبت یہ کہ "ادب" کا میدان تو ہماری طرف سے بالکل خالی ہے اور اس کمی کے نقصان کی تلافی کسی طرح نہ کی جا سکے گی۔ پچھلی نصف صدی میں محبِ اسلام اور محبِ پاکستان طاقتوں نے بھی خود اُردو زبان کے افسانوی ادب میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا، کجا کہ سندھی میں۔ ستم یہ کہ اس ملک کے بڑے بڑے علمبردارانِ اسلام کو ادب کی اہمیت کا سرے سے اندازہ ہی نہیں۔ وہ کہیں (BY THE WAY) اس پہ نگاہ ڈال لیتے ہیں۔

اب جب کہ سندھ کے مسئلے میں وقت کم رہ گیا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے علمی، معلوماتی اور صحافتی دائروں کے ساتھ ادب میں زور شور سے پیش قدمی ہونی چاہیے۔ ورنہ غفلت کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اسی سلسلے میں ایک خصوصی ضرورت یہ ہے کہ کمیونزم اور رُوسی سامراج کی اندرونی تصویر کھول کر لوگوں کے سامنے رکھی جائے۔ اس کے بالمقابل ایسا مثبت اسلامی لٹریچر ایمان واعتقاد، سیاست ومعیشت، اسلامی قومیت، اسلامی تاریخ (خصوصاً سیرتِ پاکؐ اور صحابہ کرامؓ کی سوانحات) اور اسلامی معاشرت وتہذیب کے متعلق آنا چاہیے۔ جو جدید دور کے اندازِ بیان اور طرزِ استدلال کی قوت کے ساتھ دلوں کو مسخر کر سکے۔
